چلتے ہیں تو چمن کو چلئے

مصنف

ڈاکٹر شاہد اختر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب	: چلتے ہیں تو چمن کو چلئے
مصنف	: ڈاکٹر شاہد اختر
پتہ	: غلام نبی کاٹج، فیض کالونی، تیلنی پاڑہ، ہگلی ۔ ۷۱۲۱۲۵
فون نمبر	: (033) 32993360, (M) 09339541557
سالِ اشاعت	: ۲۰۰۶ء
تعداد	: ۵۰۰
قیمت	: ۵۰ روپئے (Rs. 50/-)
ٹائپ سیٹنگ	: تسلیم عارف، (M) 09339116285
سرورق	: شاہد ساز
مطبع	: گرافک پرنٹ، ۲/۳۹، اسمٰعیل اسٹریٹ، کولکاتا۔۱۴
ناشر	: اثبات ونفی پبلی کیشنز
تقسیم کار	: عثمانیہ بک ڈپو، لور چیت پور روڈ، کولکاتا۔۷۳
	ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
	بک امپوریم، سبزی باغ، اردو بازار، پٹنہ۔۴
	اثبات ونفی پبلی کیشنز، ۸۹/۵، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتا۔۱۶

Chalte hain o Chaman Ko Chaliye

(Travellouge)

Rs. 50/-

By: Dr. Shahid Akhtar

انتساب

شرافت، وضع داری، مہمان نوازی، وفا، خلوص اور ایثار کی موہنی مورت

اہلیہ مرحومہ

نورجہاں خاتون

کے نام

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہوڑہ- پٹنہ مین لائن میں جھاجھا کی پہاڑیوں سے نکلتے ہی کیول جنکشن آتا ہے۔ اس جنکشن سے گاڑیاں جمال پور- بھاگلپور لوپ لائن کی طرف مڑتی ہیں۔ یہیں سے گیا سیکشن کی گاڑیاں بھی کھلتی ہیں۔ کیول جنکشن سے متصل کیول ندی پر ایک بڑا سا پل ملتا ہے جس کے کراس کرتے ہی لکھی سرائے کا مشہور اسٹیشن آتا ہے۔ مشہور اس لحاظ سے کہ لکھی سرائے کو تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور یہاں سے کئی اطراف کی سڑکیں نکلتی ہیں۔ ایک سڑک شمال کی جانب مونگیر کو جاتی ہے۔ مونگیر جسے میر قاسم کی وجہ سے تاریخی حیثیت حاصل ہے اور خانقاہ رحمانیہ کی فعالیت نے جسے آزاد ہندوستان میں اہم ملی حیثیت دے رکھی ہے۔ اسی مونگیر والی سڑک پر سورج گڑھا بازار ملتا ہے۔ ۷۰ء کی دہائی میں نکسلی تحریک کے ایک اہم مرکز کے علاوہ جئے پرکاش نرائن کی تحریک کے مرکزی مقام کی حیثیت بھی جسے حاصل تھی۔ اس سورج گڑھا بازار سے مشرقی ڈھلان میں اُترنے والی ایک سڑک مولانگر جاتی ہے۔ مولا شاہ بابا علیہ الرحمہ کی بسائی ہوئی یہ نگری انگریزی عہد میں بھی امتیازی حیثیت کی حامل تھی، اس لئے کہ یہاں کے زمیندار محض زمیندار نہیں تھے، علم و فضل میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، بامروت اور بااخلاق تھے۔ سادات کا یہ گھرانہ تقسیمِ ہند کے بعد تقریباً پورا ہی ہجرت کر گیا۔ جو لوگ بچ رہے، وہ اپنے اسلاف کی علمی اور اخلاقی وراثت کے سچے اور پکے امانت دار ہیں۔ یہی مولانگر میرے والدین کی جائے پیدائش ہے۔ میرے دادیہال کے کچھ افراد نے جمال پور کو وطن ثانی بنایا۔ میرے نانا چونکہ تلاش معاش میں پہلے ہی کلکتہ سے چالیس کلومیٹر شمال کی بستی تیلنی پاڑہ آ چکے تھے، اس لئے میرے والد نے تیلنی پاڑہ کو ہی اپنی قسمت آزمائی کے لئے منتخب کیا۔ ۱۹۰۵ء میں نانا آئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں والد کی شادی میری والدہ سے ہوئی۔ (والد کی پہلی شادی میری بڑی خالہ سے ہوئی تھی۔ بڑی باجی کی پیدائش کے وقت ہی ان کا انتقال ہو گیا تو خاندان والوں نے میری والدہ سے نکاح پڑھوا دیا تاکہ باجی 'سوتیلی ماں' کے عذاب سے محفوظ رہیں۔ تادم تحریر بڑی باجی کراچی میں اپنے پوتے پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں کی ایک فوج کے ساتھ بقید حیات ہیں۔ اللہ ان کو اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین!) تو وہ باجی اور امی کو لے کر تیلنی پاڑہ چلے آئے۔ تیلنی پاڑہ ہمارا وطن ثانی بنا۔ سو سال ہونے کو آئے مگر مولانگر ہمارے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہے کہ گاؤں سے آنے والا ہم سے ملنے ضرور آتا ہے۔ وہاں کی باتیں سناتا ہے۔ فلاں کے بیٹے نے فلاں امتحان پاس کیا ہے۔ فلاں کی بیٹی فلاں جگہ بیاہ دی گئی۔ فلاں کی لڑائی فلاں سے چل رہی ہے۔ وہ اس لئے سناتا ہے کہ اس کی باتیں اتنے ہی ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں، جتنے مزے لے لے کر وہ سناتا ہے۔ گاؤں کی مٹی سے آج بھی ہمارا رشتہ اس لئے قائم ہے کہ والدہ عمر کی آخری سانس (۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ء) تک Nostalgic رہیں۔ انہیں خواب بھی مولانگر کے آتے تھے۔ لوگ بچپن میں دیو پری کے قصے سنتے ہیں، ہم مولانگر سنتے تھے۔ اپنے گاؤں کی بڑائی سنانے میں زمیندار صاحبان کا ذکر خیر نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا۔ فلاں راجہ کی سواری آتی تھی تو وہ سورج گڑھا میں ہی گھوڑے سے اُتر جاتا تھا اور پیدل چل کر ہمارے گاؤں آتا تھا۔ فلاں انگریز افسر آیا تو استقبال کے لئے زمیندار صاحب

نے اپنے منشی کو دروازے تک بھیجا، خود نہیں آئے۔ فلاں صاحب نے بیرسٹری کا امتحان ولایت سے پاس کیا۔ فلاں میاں اور فلاں میاں علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ انہیں علی گڑھ چھوڑنے تمہارے ماموں گئے تھے۔ علی گڑھ میں پڑھائی ایسی ہوتی، علی گڑھ میں پڑھائی ویسی ہوتی ہے۔ اس طرح مولانگر کے وسیلے سے علی گڑھ کا نام بھی اتنی بار سنا گیا کہ اس سے بھی ایک ذہنی قلبی وابستگی ہوگئی۔ والدہ کی شدید خواہش تھی کہ میں علی گڑھ سے تعلیم حاصل کروں مگر والد گرامی کے انتقال اور بڑے بھائیوں کی معاشی تنگی نے والدہ مرحومہ کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ پھر بھی علی گڑھ کا تذکرہ کسی نہ کسی بہانے ہوتا ہی رہا۔ انٹر کے بعد میرے ہم جماعت سید محی الدین اظہر نے علی گڑھ میں داخلہ لیا تو علی گڑھ سے ذہنی وابستگی اور مستحکم ہوگئی۔ محی الدین چھٹیوں میں ٹیٹا گڑھ آتا تو دو چار پھیرے تیلنی پاڑہ کے ضرور لگتے۔ والدہ اس کی آؤ بھگت میں لگی رہتیں اور وہ بھی مجھے چڑانے کی خاطر علی گڑھ کے تعلق سے لمبی لمبی ڈینگیں مارتا۔ والدہ پہلے بہت خوش ہوتیں، پھر مجھے علی گڑھ نہیں بھیجنے کی محرومی بھی ان کے چہرے سے جھلکنے لگتی۔ ایم-اے کے بعد پی ایچ-ڈی کی باری آئی تو والدہ کا اصرار تھا کہ پی ایچ-ڈی علی گڑھ سے کی جائے۔ محی الدین نے فارم بھی بھیج دیا مگر اس بیچ میری ملازمت ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ میں بحیثیت اسسٹنٹ ٹیچر ہوگئی اور یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ادھر محی الدین کی ملازمت بھی علی گڑھ میں ہوگئی۔ کئی بار اس کی جانب سے علی گڑھ پہنچنے کی دعوت بھی دوسری مصروفیات کی نذر ہوگئی، پھر علی گڑھ سے استوار رشتہ اس وقت منقطع ہوگیا، جب کشن گنج سے منتخب ممبر پارلیمنٹ جمیل الدین صاحب کی حمایت میں انتخابی مہم چلانے کے بعد پٹنہ سے قریب باڑھ میں اس کی کار ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ محی الدین جائے وقوع پر ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ (اسی حادثے میں زخمی ہونے کی وجہ سے جمیل الدین صاحب بھی بعد کو فوت کر گئے) محی الدین کی ہلاکت ہمارے لئے ایک بڑا سانحہ تھی۔ بالخصوص والدہ کا اس صدمے سے بُرا حال تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک ہم علی گڑھ کے تذکرے سے گریز کرتے رہے۔ ایک عرصہ کے بعد ہمارے علاقے کے مدرسہ قاسم العلوم میں ایک صاحب مہتمم بن کر تشریف لائے۔ گیا کے رہنے والے تھے۔ بی ایس سی کرنے کے بعد مولویت اختیار کی تھی۔ انگریزی اچھی تھی۔ انگریزی بولنے کا بھی شوق بھی تھا۔ مجھ سے دوستی ہوگئی۔ میرے گھر آنے لگے۔ گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی۔ پان بہت کھاتے تھے۔ میرے گھر آتے، چائے کے بعد للچائی نظروں سے پاندان کی طرف دیکھتے مگر خالہ تھیں کہ سلام کا جواب دیا اور اپنے کام میں لگ گئیں۔ معاملہ یہ تھا کہ میری والدہ فاتحہ اور قیام وسلام کی نہ صرف قائل تھیں بلکہ ان کے یہاں شدت پسندی بھی تھی۔ انہیں خبر تھی کہ مولانا اس مدرسہ کے مہتمم ہیں، جہاں کا عقیدہ ان کے عقیدے سے متصادم ہے۔ میں نے مولانا کو یہ بات بتادی اور یہ بھی بتایا کہ اگر آپ موجودہ فضا کو خوشگوار بنانا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو علیگ بتا دیجیے، سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ میری بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق مولانا نے ایک دن علی گڑھ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بات ان کے کانوں تک پہنچی۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے بتایا کہ مولانا علی گڑھ کے فارغ ہیں، مولوی تو بعد کو بنے ہیں۔ اس دن سے خالہ نہ صرف ان کے سلام کا جواب دیتیں بلکہ چائے کے فوراً بعد انھیں ''بیٹا پان لو'' کہہ کے پان پیش کرتیں بلکہ جب وہ رخصت ہونے لگتے تو ایک گلوری اور بڑھا دیتیں۔ مولانا کو اس کے عوض آئے دن علی گڑھ کے واقعات سنانا پڑتے۔ (یہ سارے واقعات ان کے دوستوں کے سنائے ہوئے تھے، جنھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی) مولانا کی فنکاری یہ تھی کہ وہ سنے ہوئے قصّوں کو بیان کرتے وقت راوی کا نام نہیں لیتے تھے اور اس طرح وہ شرعی گرفت میں آئے بغیر میری والدہ اور اپنی خالہ کے لئے روحانی غذا فراہم کردیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد مولانا کی دماغی صحت تھوڑی خراب ہوگئی تو انہیں ان کے وطن جانا پڑا۔ اس طرح ایک بار پھر علی گڑھ یادوں کے نہاں خانے میں روپوش ہوگیا۔

علی گڑھ ایک بار پھر ذہن و دل پر اس وقت دستکیں دینے لگا، جب ففتھ پے کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

نےCareer Advancement کے لئے ریفریشر کورسیز کولازمی قرار دیا۔اب علی گڑھ جانے کا یہ سنہرا موقع کیسے گنوایا جاسکتا تھا۔جذبۂ شوق بے اختیار ہونے لگا۔جذبۂ شوق کو آتشِ شوق بنانے میں میرے رفیق کار دبیر احمد نے بڑا اہم کردارادا کیا۔ان کی سالی لبینا ظفر علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھیں۔انکے توسط سے فارم منگوا لئے گئے۔پرنسپل ڈاکٹر گوتم سدھانتو کو دولوگوں کو اکٹھے ریلیز کرنے پر راضی کیا گیا۔ڈرافٹس بھیج دیئے گئے ،منظوری بھی آگئی۔ریلوے ریزرویشن کا بار بھی دبیر احمد نے اُٹھایا۔۸/اپریل ۲۰۰۱ءکو پُوروا سے روانگی طے پا گئی۔عجیب صورت حال تھی۔ایک طرف ایک ماہ کے لئے بیگم اور بچوں سے جدائی کا احساس کچوکے لگا رہا تھا تو دوسری طرف اپنے خوابوں کی نگری علی گڑھ کو جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کا احساس دل میں اُمنگیں بھر رہا تھا۔ان متضاد کیفیت نے دل کی جو حالت بنا رکھی تھی ،وہ قابلِ دید تھی :

حالتِ زخمِ جگر دیکھئے اندر آکر
چشمِ خوں بار تو اک منظرِ بیرونی ہے

بہرحال ۸/اپریل کی صبح آ ہی گئی۔صبح ۷/بجے اہلِ خانہ، اہلِ خاندان اور اقرباء نے خدا حافظ کہا۔۷بج کر ۲۵منٹ پر مان کنڈو سے لوکل ٹرین ملی۔بڑے بیٹے صوفی ظفر شاہد بھتیجے ارشد جلال اور اپنے قریب ترین عزیز ابوالکلام دانش کے ساتھ ہوڑہ پہنچا۔دبیر احمد کے پہنچنے میں تاخیر سے تشویش ہو رہی تھی مگر وہ ٹرین کی روانگی سے کچھ قبل اپنے بہت اچھے دوست امتیاز احمد کے ساتھ پہنچے تو جان میں جان آئی۔جگہیں سنبھال لی گئیں۔پُوروانے ہارن دیا۔پرنم آنکھوں سے بچوں کو الوداع کہا اور اس بحرالعلوم کی طرف چل پڑے جس سے اُٹھنے والے بخارات ان بادلوں کی تخلیق کی وجہ بنتے ہیں، جو بادل اپنوں اور بیگانوں کی کشت ویراں کو گلزار بنا دیتے ہیں۔ہوڑہ سے گاڑی چلی تو ڈیڑھ گھنٹے بعد بردوان پہنچی۔وہاں سامنے کی خالی برتھ پر ایک نوجوان آیا۔اسے الوداع کہنے آنے والے سارے لوگوں کی آنکھیں نم تھیں۔نوجوان کو اپنے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ٹرین چلی تو اس کی دل گرفتگی نے ہم سب کو دل گرفتہ کردیا۔اس نوجوان کا نام قاضی محی الدین تھا اور وہ بردوان ضلع کے مشہور گاؤں گھسکرا کا رہنے والا تھا۔دہلی جارہا تھا، جہاں سے پرسوں اس کی سعودی عربیہ کے لئے فلائٹ ہونے والی تھی۔ہم لوگوں نے اس کی دل جوئی شروع کی۔تھوڑی دیر میں وہ پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔پیچھے والے بنک میں شاہین سلطانہ (صدر، شعبۂ اُردو، لیڈی برابورن کالج)اپنے والدین کے ساتھ تھی۔شاہین کو بھی ریفریشر کورس میں شرکت کرنا تھی۔اگلے بنک میں تبلیغی جماعت کے افراد تھے جو بستی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں 'مشورے' کے لئے جارہے تھے۔ہمارے ہی بنک میں ایک بنگالی فیملی بھی تھی جن کی ایک چار سالہ پیاری سی بچی ہماری دل بستگی کا سامان کررہی تھی۔اگلا پڑاؤ آسنسول تھا۔(آسنسول مغربی بنگال کے ان علاقوں میں سے ایک ہے، جن کی شناخت اردو ایریا کی حیثیت سے ہو چکی ہے۔اردو والوں کا مطالبہ ہے کہ یہاں کی دوسری سرکاری زبان اردو بنائی جائے مگر متعصب نوکر شاہی اس کام میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے)ٹرین رُکی تو اپنے کوچ کے سامنے پروفیسر مشتاق اعظمی (صدر، شعبۂ اُردو، ٹی ڈی بی کالج، رانی گنج)اور ان کی پیاری بچی سیمیں رخسار کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔دراصل انہیں میرے رفیق کار نے کل رات ہی فون پر بتا دیا تھا کہ ہم کس کوچ سے سفر کررہے ہیں۔ان سے بخیریت اور کامیاب سفر کی دعائیں ملیں اور پھلوں کا ایک تھیلا ملا جوان کے خلوص اور محبت کا ثبوت تھا۔دورانِ سفر ان کے دیئے ہوئے سنگترے اوائل اپریل کی ان گرم ہواؤں کے مقابلے میں ہمارے مددگار ثابت ہورہے تھے جو گنگا کے میدانی علاقوں میں دن کا موسم گرم رکھتی تھیں اور غروب آفتاب کے بعد فرحت بخش بن جاتی ہیں۔غروب آفتاب کے وقت ہم لوگ گیا کے پہاڑی دروں سے گذر رہے تھے۔تین مقامات پر تو ایسا گھپ اندھیرا ہو گیا کہ رات کی سیاہی پھیکی پڑ گئی۔ڈہری اون سون اور سہسرام ہوتے ہوئے مغل سرائے پہنچے تو رات ہو چکی

تھی۔کھانے کی تیاری شروع ہوئی قاضی محی الدین اور شاہین کے والد بھی کھانے میں شامل تھے۔سارے شرکائے سفر تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ برتھیں سنبھال لی گئیں۔گذشتہ رات کی بے خوابی اور دن بھر کے سفر کی تکان نے بہت جلد ہمیں نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔صبح پونے پانچ بجے آنکھ کھلی تو ٹرین کو ٹنڈلا اسٹیشن پر موجود پایا۔ پتہ چلا کہ محض ایک گھنٹہ کی مسافت ہمیں ہماری منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ برتھیں چھوڑ دی گئیں فریش ہوکر چائے پی گئی۔ پانچ بج کر پچاس منٹ پر قاضی محی الدین نے علی گڑھ اسٹیشن پر ہمیں اُترنے میں مدد کی۔ہم نے گلے لگ کر قاضی کو بخیریت سعودی عربیہ پہنچنے اور کامیاب لمبی عمر کی دعائیں دیں۔ٹرین نے ہارن دیا اور قاضی کی بھیگی پلکیں ہمیں الوداع کہنے لگیں۔

راجدھانی دہلی سے ۱۴۰ رکلومیٹر جنوب مشرق میں واقع علی گڑھ کے اسٹیشن پر اُترتے ہی ایک عجیب سی سرشار کی کیفیت میں ہم ڈوب گئے۔حواس مجتمع کر کے ہم پلیٹ فارم نمبر دو سے ایک پر چلے آئے،اس لئے کہ ہمیں لینا ظفر لینے آنے والی تھیں اوران کے آنے میں کچھ تاخیر ہورہی تھی۔تھوڑی دیر میں لینا اپنی دو سہیلیوں نشی اور آمنہ اوراپنی بڑی بہن دیبا کے ہم جماعت سیّد کوثر شمیم کے ساتھ آئیں تو ہمارا قافلہ حرکت میں آ گیا۔ ہمارے سامان رکشا گاڑیوں میں اُٹھا دیئے گئے۔ وہاں کی رکشائیں کلکتہ کے اطراف میں چلنے والی رکشاؤں سے مختلف ہیں۔نشت کی چوڑائی کچھ زیادہ ہوتی ہے مگر پشت پرٹیک لگانے کی جگہ اتنی کم ہوتی ہے کہ بے خیالی میں یہاں کی طرح ٹیک لگانے کی کوشش آدمی کو نیچے گرا سکتی ہے۔اس لئے ہم محتاط ہوکر بیٹھے اور ہماری سواریاں اسٹیشن سے نکل کر شمالی سڑک پر دوڑنے لگیں۔بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد حکیم اجمل خاں طیبہ کالج کے سامنے اکاڈمک اسٹاف کالج کی طرف مڑنے والی سڑک پر ہم روک دیئے گئے۔سیّد کوثر شمیم نے جا کر پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہماری دفتری کارروائی تین بجے کے بعد شروع ہوگی۔ہم یونیورسٹی کیمپس کی طرف روانہ ہوگئے۔یونیورسٹی روڈ پر کچھ دور چلنے کے بعد باوقار اور پرشکوہ ''بابِ سیّد'' دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ پتہ چلا کہ وائس چانسلر محمود الرحمٰن صاحب کے زمانے میں اس دروازے کی تعمیر مکمل ہوئی۔اس کی چوڑائی اتنی کہ بیک وقت چار گاڑیاں دروازے سے داخل ہوجائیں۔باب سیّد پر عَلّمَ الانِسَانَ مَالَمْ یَعلَم کی نمایاں تحریر دیکھ کر اللہ اکبر کی صدا بے اختیار بلند ہوگئی۔اس باب سے یونیورسٹی حدود میں داخل ہونے کے بعد لینا،نشی اور آمنہ کی سواری معین ہاسٹل کی طرف مُڑ گئی۔کوثر ہمیں لے کر آفتاب ہوسٹل چلے۔راستے میں بائیں طرف ایس ایس ہال کی عمارت ملی۔محی الدین کی یاد تازہ ہوگئی۔مرحوم ابتدائی زمانۂ طالب علمی میں اسی ہال کے کمرہ ۵٦ میں مقیم تھے۔ان کے اکثر خطوط اسی ہال کی یادگار ہیں۔اللہ مرحوم کو جنت الفردوس کی بہاریں عطا کرے۔ آمین! آفتاب ہوسٹل کے کمرہ ۳۷ میں اپنا سامان رکھ کر غسل سے فراغت حاصل کی۔ناشتہ کیا اور پھر معین ہاسٹل کے لئے روانہ ہوئے۔اس لئے کہ کلکتہ سے آیا ہوا لینا کا تحفہ ہمارے سامانوں میں بندھا رہ گیا تھا۔معین ہوسٹل پہنچے تو لڑکیوں کے ہوسٹل کا حسن انتظام دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اونچی چہار دیواری کے بڑے پھاٹک پر اپنی پہچان اور مقصد بتانے پر داخلے کی اجازت ملی۔اندر ایک وسیع انگنائی جس کی داہنی طرف ایک چھوٹا سا کمرہ درمیان میں ایک میز اور چار پانچ کرسیاں اس ملاقاتی کمرے کا دروازہ بغیر پٹ کا۔سامنے ہوسٹل کی بڑی سی عمارت ہم اس کھلے کمرے میں بٹھا دیئے گئے۔ہوسٹل کے اندر خبر بھیجی گئی۔اندر سے خبر آئی کہ آمدورفت کی تفصیل ب بتانے والے رجسٹر کے مطابق لینا فیکلٹی میں ہیں۔ہم پھر بڑے دروازے سے باہر آئے۔دو منٹ کا فاصلہ چھ منٹ میں طے کر کے فیکلٹی گئے۔ پتہ چلا کہ ان کی واپسی ہوسٹل میں ہوچکی ہے۔ہوا یوں کہ جب ہم باہری راستے طے کر کے ادھر آرہے تھے،وہ لڑکیوں کے لئے بنائے گئے راستے سے ہوسٹل کو واپس جا رہی تھیں۔لینا نہیں ملیں۔ہم شعبۂ اُردو کی طرف بڑھے تو شعبے کے نوجوان استاد اور ہردلعزیز جوان شاعر ڈاکٹر سراج اجملی مل گئے۔وہ ہمیں شعبے میں لے گئے۔تھوڑی گفتگو کے بعد میں نے قمرالہدیٰ فریدی کے بارے میں پوچھا تو مجھ سے دریافت کیا گیا کہ کیا میری ان سے پرانی ملاقات ہے۔میں نے بتایا کہ قمر

الہدیٰ فریدی شیخ پورہ کے جس روحانی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں،اس سے ارادتِ قلبی رکھتا ہوں۔اس کے علاوہ سید محی الدین اظہر کے توسط سے بھی غائبانہ تعارف رہا ہے۔محی الدین کے انتقال پر قمرالہدیٰ فریدی نے ایک بڑا بھر پور تاثراتی خاکہ' اظہر بھائی' قلمبند کیا تھا جس خاکے نے مجھے بڑا رُلایا تھا۔ جناب تشریف لائے۔ میں نے گلے سے لگایا، باتیں ہوئیں، چائے پی گئی اور پھر معین ہوسٹل کے اسی ملاقات والے کمرے میں لینا،نشی اور آمنہ سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ان لوگوں نے مٹھائی کھلائی،ٹھنڈا پانی پلایا۔دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگیوں میں شیرینی بھر دے اور انھیں ٹھنڈا اور آسودہ رکھے۔وہاں سے سیدھے اکاڈمک اسٹاف کالج آئے۔ بتایا گیا رپورٹنگ ٹائم چھ بجے شام ہے۔وہاں آفتاب ہوسٹل واپسی ہوئی۔سیّد شمیم کوثر نے ضیافت کی کھانے کے بعد تھوڑا آرام، پھر اکاڈمک اسٹاف کالج منتقلی کا مرحلہ۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے دفتری کارروائی کا سلسلہ جاری تھا۔ایک صاحب بہت تیزی کے ساتھ دفتری کام نمٹا رہے تھے۔پتہ چلا ذوالفقار نام ہے۔اکاڈمک اسٹاف کالج کی فعالیت کا انحصار کسی حد تک ان ہی پر قائم ہے۔ہماری باری آئی تو سارے مراحل طے پرنے کے بعد کمرہ ۱۹ کی چابی ہمارے حوالے کی گئی۔ دو موم بتیاں ایک ماچس کی ڈبیہ، ایک ڈبہ COIL اور ایک پرچی دی گئی۔ پرچی Wilf Life Protection کے شعبے کی جانب سے تھی جس میں ہمیں بندروں سے ہوشیار کیا گیا تھا اور ان کے حملوں سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں۔ پہلے تو ہنسی آئی، پھر اس خوف سے پسینے چھوٹ گئے کہ اگر بندروں نے حملہ کر دیا تو کیا ہوگا۔کمرہ ۱۹ چھوٹا سا کمرہ جس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ایک گول میز تھی۔دو کرسیاں تھیں۔ دونوں طرف طاق بنے ہوئے تھے جو الماریوں کے متبادل کے طور پر استعمال کے لئے بنائے گئے تھے۔ایسے کمروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ درمیان میں دو بیت الخلاء اور ایک غسل خانہ تھا۔ یہ دراصل اکاڈمک اسٹاف کالج کا پچھلا حصہ تھا۔درمیان میں ایک کشادہ آنگن تھا جس سے گزر کر اسٹاف کالج کی لائبریری اور کامن روم سے ہوتے ہوئے لیکچر ہال تک جایا جاسکتا تھا۔عورتوں کے لئے اسٹاف کالج کی عمارت میں دو منزلہ پر قیام کا انتظام تھا۔ہم نے اپنے کمرے کو دیکھا بھالا۔طاقوں میں اپنے سامان رکھے اور پھر یونیورسٹی کیمپس روانہ ہوئے، جہاں حیات مارکیٹ میں رات کا کھانا کھایا اور لوٹ آئے۔

۱۰/ اپریل ہمارے ریفریشر کورس کے آغاز کی تاریخ تھی۔غسل وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم نے طبّیہ کالج کے سامنے والے اسلام میاں کے ڈھابے میں چائے پی اور واپس آئے۔افتتاحی پروگرام کے بعد کورسیز شروع ہونا تھے۔اکاڈمک اسٹاف کالج کا بیک یارڈ اور ہمارا آنگن سجا دیا گیا تھا۔کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر مختلف صوبوں سے آئے ہوئے اردو، جغرافیہ اور فیزکس کے اساتذہ براجمان تھے۔انتظار تھا میز بانوں کا۔کچھ شخصیتیں آئیں اور پروگرام شروع ہوگیا۔ پہلے تینوں کورس کو آرڈی نیٹرز کا تعارف کرایا گیا اور پھر اکاڈمک اسٹاف کالج کی ڈائریکٹر پروفیسر حمیدہ احمد کا خطبہ شروع ہوا۔ پروفیسر حمیدہ احمد نے ساڑی اور پوری آستین کی قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔نکلتا قد، گندمی رنگ، چوڑی پیشانی اور ایک باوقار مسکراہٹ۔عالمانہ شان کی اس خطابت نے ہم سب کو متاثر کیا۔انہوں نے اپنے بیٹے یاسر کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کر کے ایک استاد کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا نسخہ بتایا۔ساتھ ہی ایک استاد کی مقبولیت کے اثرات بھی بتائے۔ان کی دلپذیر تقریر نے افتتاحی پروگرام کو عظمت سے ہمکنار کر دیا۔ڈائریکٹر صاحبہ کی اہلِ زبان کے طرز پر انگریزی گفتگو اور ان کی شستہ اور فصیح اردو نے ان کی عالمانہ حیثیت پر مہر ثبت کر دی تھی۔اس تقریب کے مہمانِ خاص روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر زاہد زیدی نے تدریسی خدمات کو اپنا موضوع بنایا۔ہم دیر تک اس چشمۂ علم سے فیضیاب ہوتے رہے۔چائے نوشی کے وقفے میں ڈاکٹر زیدی نے ہم لوگوں سے دوستانہ کلام کر کے ہمارے دل جیت لئے۔ساڑھے بارہ بجے پہلا لیکچر شروع ہوا۔کو آرڈی نیٹر ڈاکٹر صغیر افراہم نے مشہور استاد، ادیب اور ناقد پروفیسر نورالحسن

نقوی کا تعارف کرایا۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے اپنی ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تقریر میں شعری اصناف کے تعارف کا حق ادا کر دیا۔ سیشن ختم ہوا تو اردو کے شرکاء کا آپس میں تعارف ہوا۔ آپ ڈاکٹر عبدالوحید ہیں۔ حسین گنج، سلطان پور (یوپی) کے ہیں۔ بلیا کے ایک پی جی کالج میں استاد۔ آپ ڈاکٹر بیگ اختر مرزا ہیں۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) وطن ہے اور وہیں کے چشتیہ کالج میں درس دیتے ہیں۔ آپ گلزار عالم، یوپی وطن ہے، تھانے (مہاراشٹر) میں مقیم ہیں اور مڑ گاؤں کے برہانی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر حامد اشرف ہیں۔ لاتور (مہاراشٹر) کے باشندے ہیں۔ ملازمت بھی وہیں کے ایک کالج میں ہے۔ آپ ابراہیم غلام نبی شیخ ہیں۔ گجرات کی راجدھانی احمد آباد کے ہیں اور وہیں کے آرٹس اینڈ کامرس کالج کے سینئر استاد ہیں۔ آپ امتیاز احمد ہیں۔ خوبصورت اور خوب سیرت۔ شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی کے زیب و زینت۔ آپ ڈاکٹر اشتیاق اعظمی ہیں۔ اعظم گڑھ کے مردم خیز علاقے سے تعلق ہے اور جونپور کے ایک پی جی کالج کے وائس پرنسپل ہیں۔ آپ ڈاکٹر محبوب عالم جلال پور کے ہیں اور ٹانڈہ کے ایک کالج میں سلسلۂ تدریس ہے۔ منظور احمد خاں، سانولی رنگت کے دبلے پتلے نوجوان ہیں۔ بھدرک اُڑیسہ کے ایک کالج میں شعبۂ اُردو کی جان ہیں۔ آپ ڈاکٹر مظہر مہدی ہیں۔ آبائی وطن بہار ہے۔ ملک کی مرکزی درس گاہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سینئر اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق (انعام اعظمی) ڈہری ان سون کے رہنے والے، سہسرام کے ایک کالج سے لگے ہوئے ہیں۔ تنقید کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ محمد اسرائیل میرے مرشد کی نگری دھام نگر، اُڑیسہ کے باشندے بھی اور وہیں کے کالج میں استاد بھی ہیں۔ آپ ڈاکٹر محمد ضیاءاللہ، خوش شکل، خوش لباس اور جامہ زیب۔ شہید ٹیپو سلطان کے ہم وطن اور وہیں کی یونیورسٹی میں اردو کے کامیاب استاد۔ ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ، وطن بہار اور شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کے مقبول نوجوان استاد۔ آپ ڈاکٹر محمد علی جوہر، علی گڑھ کے پروردہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی آن بان۔ آپ ہیں ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے۔ بمبئی یونیورسٹی میں اردو کے استاد اور اردو کے چند مشہور افسانہ نگاروں میں ایک۔ آپ ڈاکٹر سہیل احمد بیابانی ہیں۔ بھلے ہی بیابان میں ہوں مگر ان کے گھر اورنگ آباد اور ان کے کالج لاتور دونوں جگہ بہار آئی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ ہیں ڈاکٹر شہزاد انجم، گیا کے مردِ میدان۔ رام پور کی لڑکیوں کے کالج کے استاد (ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریڈر)۔ آپ ہیں شیخ اختر شاہ، رہائش اور تدریس دونوں لحاظ سے احمد آبادی ثم گجراتی۔ آپ ڈاکٹر شیخ غلام دستگیر عبدالغفور ہیں۔ شولا پور میں رہتے ہیں۔ کولہا پور میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر غین عین شیخ کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر شیخ صدیق محی الدین ہیں۔ مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں اُردو شعبے کی جان ہیں۔ آپ ڈاکٹر ایس ایس اے اشرفی حضرت جہانگیر اشرف سمنانی علیہ الرحمۃ والرضوان سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں۔ آگرہ کے مشہور سینٹ جانس کالج میں عرصہ سے اردو پڑھا رہے ہیں۔ آپ ہیں ڈاکٹر سیّد وحید پاشا، آندھرا پردیش کے ردونی کے باشندے ہیں اور وہیں کے کالج میں اردو کے استاد بھی ہیں۔ ڈاکٹر تحریر بیگ، مشرقی اُتر پردیش کے بلیا کے رہنے والے بھی ہیں اور وہیں کے ایک کالج میں تدریسی خدمت انجام دینے کے علاوہ تحریر انجم کے ادبی نام سے شعر بھی کہتے ہیں۔ آپ ہیں ڈاکٹر یعقوب علی خاں، کانپور سے متصل ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، بھوپال میں تعلیم مکمل کی اور وارانسی کے ایک زنانہ کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ادبی دنیا میں یعقوب یاور کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ بہت لکھتے ہیں، اس لئے اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی گنتی خود بھول جاتے ہیں۔ مشرقی ہند کی نمائندگی کیلئے یہاں موجود ہیں ڈاکٹر دبیر احمد، مقبول استاد اور اُبھرتے ہوئے نوجوان ناقد اور یہ خاکسار شاہد اختر۔

مردانہ سائڈ کا تعارف مکمل ہوا تو ان کا تعارف شروع ہوا جن کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ آپ ہیں عابدہ نور محمد چندریگر احمد آباد میں رہتی ہیں اور وہیں اپنے استاد ابراہیم غلام نبی بخش کی رفیق کار ہیں۔ آپ ہیں فہیم النساء۔ بنگلور کی رہنے والی اور وہیں کی

مہارانی سائنس کالج میں اردو کی استانی۔آپ ڈاکٹر فہمیدہ خاتون ہیں۔فیض آباد میں قیام اور وہیں آر ایم جی پوسٹ گریجویٹ کالج میں اردو پڑھاتی ہیں۔آپ ہیں فرزانہ شیخ،شولاپور مہاراشٹر وطن بھی ہے اور وہیں کے ایک مہیلا کالج میں شعبۂ اردو کی بقا کی ضامن بھی۔آپ ہیں نفیس بانو،علی گڑھ سے فراغت ہوئی وارانسی میں رہتی ہیں۔وہاں کے وسنتا کالج میں پڑھاتی ہیں اور اردو کے افسانوی ادب میں اپنی پہچان رکھتی ہیں۔آپ ڈاکٹر نیلم فرزانہ ہیں۔علی گڑھ کے ویمنس کالج میں درس دیتی ہیں۔واجد علی شاہ کا وطن ثانی مٹیابرج آپ کی جائے پیدائش۔مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد اور نقاد عقیل احمد صاحب کی زوجہ محترمہ ہیں۔آپ نسرین بیگم ہیں۔آپ کی فراغت بھی علی گڑھ سے ہوئی۔آگرہ رہتی ہیں اور وہیں کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج کی شان ہیں۔آپ ڈاکٹر رقیہ جعفری ہیں۔شہرانیس میں پیدا ہوئیں،وہیں کی لڑکیوں کے ایک پی جی کالج میں پڑھاتی ہیں۔آپ شیخ میمونہ اللہ بخش ہیں۔شولاپور میں رہتی ہیں۔وہیں لڑکیوں کے ایک کالج میں تدریس سے جڑی ہیں۔آپ ڈاکٹر شاہین سلطانہ ہیں۔کلکتہ کے مشہور سرکاری کالج لیڈی برابورن کے شعبۂ اردو کی اب تک کی سب سے کمسن ہیڈ ہیں۔آپ شمیم زہرہ کاظمی ہیں۔تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔میرٹھ کی رہنے والی ہیں۔وہیں کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج میں خدمتِ درس پر مامور ہیں۔آپ سیّدہ نسیم النسا ہیں۔مہاراشٹر کے اورنگ آباد میں رہتی ہیں اور وہیں کے ایک کالج میں پڑھا رہی ہیں اور آپ ہیں زیب النساء عبدالرحمٰن شیخ،احمد آباد کی رہنے والی ہیں اور وہیں کے ایف ڈی کالج میں شعبۂ اُردو کی اہم ترین رکن ہیں۔

ہم چالیس شرکاء کے کورس کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر صغیر افراہم کی فراغت بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوئی۔شعبۂ اُردو میں درس وتدریس سے وابستگی ہوئی تو علی گڑھ کو وطن ثانی بنالیا۔اردو فکشن کی تنقید میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔کئی کتابوں اور سینکڑوں مضامین کے خالق ہیں۔ان کی کتاب ''پریم چند-ایک نقیب'' کے ہندی سمیت کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' اور''نثری داستانوں کا سفر'' کے علاوہ ان کی حالیہ تصنیف ''اردو فکشن-تنقید اور تجزیہ'' انہیں اُردو فکشن کی صفِ اول کے ناقدین میں جگہ دیتی ہیں۔کورس میں شامل عورتوں کی مکمل خبر گیری اور نگرانی کے لئے ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اپنی بیگم ڈاکٹر سیما صغیر کو اپنے اسسٹنٹ کے طور پر مامور کیا ہے۔ڈاکٹر سیما صغیر خوش اخلاق اور خوش گفتار ہونے کے علاوہ اچھی ادیبہ بھی ہیں۔ان کی کتاب ''مطلعِ افکار'' ان کی شکل میں اردو کی ایک بڑی ادیبہ کی پہچان قائم کرنے میں دلیل کا درجہ رکھتی ہے۔

اسی تعارفی دور میں جب ڈاکٹر صغیر اور بیگم سیما صغیر کو یہ معلوم ہوا کہ میں مغربی بنگال کے ضلع ہگلی سے تعلق رکھتا ہوں تو انہوں نے پوچھا آپ ہگلی ضلع کے بیدیاباٹی سے واقف ہیں۔میں نے پوچھا کیوں؟ تو بتایا گیا کہ ڈاکٹر سیما صغیر کے بڑے بھائی وہیں رہتے ہیں۔میں نے پوچھا ان کا مشغلہ کیا ہے؟ بتایا گیا وہاں کے ایک اینگلو اردو اسکول کے بانی مہتمم اور نگراں ہونے کے علاوہ ایک مسجد میں امام بھی ہیں۔میں نے کہا بھائی آپ جاننے کی پوچھتے ہیں میں تو ان کے بھائی ہی نہیں ان کے والد گرامی مولانا عبیدالرحمٰن حسنی علیہ الرحمہ سے بھی واقف ہوں۔مولانا عبید الرحمٰن علیہ الرحمہ عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔اطراف وجوانب کے تشنگانِ علم کے لئے تو وہ چشمۂ سیرابی تھے۔ان سے اکتساب فیض کرنے والوں میں یہ خاکسار بھی ہے اور ان کے بھائی مولانا سید احسن المظفر سے تو میرے برادرانہ تعلقات ہیں۔اس طرح اس پہلی ملاقات میں ہی ہماری ان سے رشتہ داری قائم ہوگئی۔ریفریشر کورس کی اس پوری مدت میں ڈاکٹر سیما صغیر نے Ladies Participants کا جس طرح خیال رکھا،وہ ان کی خاندانی شرافت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

اس تعارفی سیشن کے بعد ہم نے طیبہ کالج کے بغل والے راستہ سے آگے جا کر تصویر محل کے بازو والے ہوٹل میں کھانا کھایا۔واپسی

میں اکاڈمک اسٹاف کالج کے احاطے میں سرسبز درختوں کی چھاؤں میں ایک بغیر چھاؤنی والی گھری ہوئی جگہ کو دیکھ کر تجسس بڑھا کہ یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ جگہ نماز کے لئے مخصوص ہے اگر آپ چاہیں تو نمازِ باجماعت کا اہتمام ہوسکتا ہے۔ہم نے اپنے چند ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ جائے نماز کے لئے requisition دیا۔مغرب سے پہلے ذوالفقار کی مہربانی سے ہماری مطلوبہ چیزیں ہمیں مل گئیں۔محمد اسرائیل نے اذان دی اور چالیس میں سے بیشتر نیز دوسرے کورس کے مصلّیوں نے صف جمادی اور ناچیز کو امام مقرر کردیا۔بے ساختہ میرؔ یاد آ گئے :

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

کورس کے اختتامی دن کی فجر تک باضابطہ جماعت قائم ہوتی رہی۔ پتہ نہیں بعد کے کورسیز میں آنے والے افراد نے اس کا اہتمام کیا یا نہیں۔ بہرحال مغرب کی نماز کے بعد ہم نے آفتاب ہوسٹل کے کمرہ ۳۷ کا رُخ کیا۔آفتاب ہوسٹل آفتاب ہال کا وہ ہوسٹل ہے جس میں سینئر طلبہ ہی جگہ پاتے ہیں۔آفتاب ہال کی طرح یونیورسٹی کیمپس میں مندرجہ ذیل ہال اور ہیں :

۱-عبداللہ ہال (لڑکیوں کے لئے)	۲-علامہ اقبال ہال	۳-ہادی حسن ہال
۴-محسن الملک ہال	۵-محمد حبیب ہال	۶-ندیم ترین ہال
۷-اندرا گاندھی ہال (لڑکیوں کے لئے)	۸-راس مسعود ہال	۹-سرسید ہال (شمالی)
۱۰-سرسید ہال (جنوبی)	۱۱-سرسلیمان ہال	۱۲-سرضیاءالدین ہال
۱۳-سروجنی نائیڈو ہال (لڑکیوں کیلئے)	۱۴-وقارالملک ہال	۱۵-این آر ایس سی

ہر ہال میں تین چار ہوسٹل ہیں۔ ہر ہال کا الگ کامن روم اس کی اپنی لائبریری اور اپنی عبادت گاہ ہے۔ہم بات آفتاب ہوسٹل کے کمرہ ۳۷ کی کر رہے تھے جو علی گڑھ میں ہمارے پہلے مرد میزبان سید کوثر شمیم کا کمرہ تھا۔سید کوثر شمیم قنوج کے رہنے والے خوبصورت اور انتہائی خلیق نوجوان ہیں۔جغرافیہ میں پی ایچ-ڈی کا مقالہ قلمبند کر رہے ہیں۔وہ نہیں ملے تو ہم شمشاد چلے گئے۔چائے پی رہے تھے کہ کوثر اپنے کزن مزمل کے ساتھ آ گئے۔انہوں نے کہا چلیئے آپ لوگوں کو لائبریری گھمالاتے ہیں۔مولانا آزاد لائبریری (جو چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی ہندوستان کی واحد لائبریری ہے) دیکھنے کی خواہش ہمیں کشاں کشاں اُس کی عظیم الشان عمارت تک لے گئی۔جس وقت ہم لائبریری پہنچے، رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔لائبریری اوپر سے نیچے تک کھچاکھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ ذوق وشوقِ مطالعہ قابلِ دید تھا۔لائبریری کینٹین کے سامنے والے میدان میں چائے پی۔پیالیاں وہیں لڑھکا دی گئیں۔کینٹین کا عملہ میدان میں جابجا چائے کی پیالیاں ڈھونڈ رہا تھا۔استاد مرحوم اعزاز افضل یاد آ گئے :

تمہارا عالمِ مستی ڈھکا چھپا ہی سہی
میری نگاہ ہے ٹوٹے ہوئے پیالوں پر

وہاں سے واپسی میں کینیڈی ہال اور مختلف فیکلٹیوں کی زیارت کرتے ہوئے 'پرینکا' میں رات کا کھانا کھایا اور پون بجے قیام گاہ پہنچ کر بسترِ استراحت پر دراز ہوگئے۔

۱۱/اپریل سے ریگولر کلاسیز کا سلسلہ شروع ہوا۔ پانی کی ٹنکی خراب تھی۔نہانا دھونا ایک مسئلہ ہوگیا۔ ناشتے کا سپلائر بھی آج اپنی دکان بڑھا گیا، پھر بھی صبح نو بجے سے پہلے تیاری کے تمام مرحلے طے کرنے ہی پڑے۔ پہلا لیکچر ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس اور شعبۂ ہندی کے سربراہ

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا کا تھا۔ موضوع تھا 'ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا اثر اردو پر' ڈاکٹر زیدی جعفر رضا یوں تو ہندی کے نامور استاد ہیں مگر اردو زبان وادب پر ان کی عالمانہ دسترس نے ہمیں بھونچکا کر دیا تھا (بعد کو 'الفاظ' میں معین احسن جذبی پر ان کا یادگار خاکہ پڑھا۔ خاکہ پڑھ کر لگا کہ ہندی کا استاد ہونے کا الزام کسی نے ان پر لگا دیا ہے) فلسفہ وحدت الوجود کی گتھیوں پر میرے بعض سوالات کے جواب نے ہماری الجھنیں دور کر دیں۔ دوسرے سیشن میں ظفر صدیقی تشریف لائے۔ مولویانہ وضع قطع کے بہت شریف اور بہت قابل انسان۔ ان کی شرافت اور قابلیت کے مداحوں میں یعقوب یاور پہلے سے موجود تھے۔ بعد میں ہم سب شامل ہوگئے۔ عربی فارسی میں اصنافِ سخن کی درجہ بندی سے لے کر اردو کی اصنافِ شاعری پر نان اسٹاپ بولتے چلے گئے۔ تیسرے سیشن کے ریسورس پرسن پروفیسر فرحت اللہ خاں تھے۔ رام پور کے نوابی خاندان کے چشم و چراغ، انگریزی کے نامور استاد اور اردو انگریزی کے مشہور ادیب۔ ان کی تقریر سے محظوظ ہونے کی خاطر انگریزی کے مشہور استاد اور اردو کے ادیب سیّد امین اشرف سمیت یونیورسٹی کے کئی اساتذہ پچھلی کرسیوں پر براجمان تھے۔ پروفیسر فرحت اللہ خاں نے انگریزی ادب کے ارتقائی سفر کے اپنے اصل موضوع پر اظہارِ خیال سے قبل ادب کیا ہے؟ نظم کیا ہے؟ نظم کیسے پڑھائیں؟ ان تین سوالات پر بڑی دلپذیر گفتگو کی۔ لیکچرز ختم ہونے کے بعد تھوڑی گپ شپ، پھر کھنڈیل وال میں کھانا، مغرب کی نماز کے بعد آفتاب کے کمرہ ۳۷ کا رُخ۔ ۳۷ بند تھا، ۳۸ کو ناک کیا۔ جمیل الرحمٰن سے ملے۔ کل ان سے تعارف ہوا تھا آج جم کر باتیں ہوئیں۔ ہند-نیپال سرحد کے بیر پور کے رہنے والے جمیل الرحمٰن پالیٹیکل سائنس میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ہر موضوع پر بہت پڑھتے ہیں۔ مجاز، حقیقت و یدانت سے لے کر صوفی ازم پر بے تکان بولتے رہے۔ اس نوجوان کے ذوقِ مطالعہ اور زورِ بیان دونوں نے دل خوش کر دیا۔ ہم دونوں پرچی لگا کر شمشاد چائے نوشی کے لئے پہنچے۔ تھوڑی دیر میں کوثر، مزمل اور دبیر احمد آگئے۔ چائے کے بعد منٹو سرکل چلنے کا فیصلہ ہوا۔ کل ہی کوثر کے ایک رشتے کے بھائی توقیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ آٹھویں جماعت کا طالب علم، بہت خوبصورت، بڑی پیاری زبان۔ ہم لوگ توقیر سے ملنے گئے۔ وہاں کے دو اساتذہ تنویر اور عامر صاحبان سے منٹو سرکل کے تعلیمی معیار اور وہاں کی تربیت کے انداز پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ ہمیں وہ کمرہ بھی دیکھنے کو ملا جس میں پاکستان کے مشہور حکمراں فیلڈ مارشل ایوب خاں منٹو سرکل کے طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے۔ منٹو سرکل کی لائبریری میں رات کے دس بجے نونہالانِ ملت کو مصروفِ مطالعہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ واپسی میں چنگی میں آم کا شربت پی کر کلیجہ ٹھنڈا کیا گیا۔ تقریباً چار کلومیٹر کا لمبا راستہ طے کر کے آفتاب پہنچے۔ اکٹھے رات کا کھانا کھایا اور قیام گاہ واپس۔

۱۲/اپریل کی صبح پانی کی سپلائی بھی ٹھیک ہوگئی تھی اور ناشتے کا انتظام بھی صحیح تھا۔ کورس کے ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں کے بعد لیکچر ہال میں اپنی اپنی نشستوں پر قبضہ۔ پہلے دن سے ہی نشستیں مخصوص ہوگئی تھیں اور آخری دن تک یہ ترتیب برقرار رہی۔ ہال کی بائیں جانب یعنی ڈائس سے داہنی طرف کی پہلی قطار میں محبوب عالم، یعقوب یاور، دبیر احمد اور میں۔ بائیں طرف کی پہلی قطار میں فہمیدہ خاتون، سیدہ نسیم النساء، شاہین سلطانہ اور رقیہ جعفری۔ پچھلی قطار میں ایس ایس اشرفی، گلزار عالم، امتیاز احمد اور محمد علی جوہر رہا کرتے تھے۔ پچھلی صف کے کونے میں بیگ اختر مرزا ہوتے۔ بیگ اختر مرزا اچھے مصور بھی ہیں۔ ایک سلسلہ آخر تک یہ بھی رہا کہ آنے والے مقرر کا اسکیچ بنا کر وہ آگے بڑھا دیتے۔ وہ اسکیچ گھومتا ہوا آخر میں مجھ تک آتا۔ میں مقرر کے تعلق سے ایک شعر فی البدیہہ لکھ کر لوٹا دیتا۔ وہ اسکیچ شعر کے ساتھ پھر تمام لوگوں تک ہوتا ہوا بیگ اختر مرزا کے پاس چلا جاتا۔ پچھلی صف میں کچھ کرسیاں خالی رہتی تھیں جن پر خاص مقررین کو سننے یونیورسٹی اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز آکر بیٹھتے تھے۔ ہماری ریزرویشن ایک دن خطرے میں پڑ گئی تھی، جب دبیر احمد اور میں بیچ کی نشستوں پر معین الدین جینابڑے سے محوِ گفتگو تھے۔ ہماری

سیٹوں پر نفیس بانو اور نسرین بیگم نے قبضہ کرلیا۔ ہم نے احتجاج کیا تو نفیس نے احتجاج مسترد کردیا تو میں نے کہا چلئے اسی بہانے ہمیں آپ کی پشت پناہی کا شرف حاصل ہوجائے گا۔ یہ سنتے ہی ہماری کرسیاں ہمیں واپس کردی گئیں۔ بہر حال ۱۲ راپریل کا پہلا لیکچر پروفیسر صلاح الدین عمری کا تھا۔ اردو ادب پر عربی کے اثرات پر ان کا فاضلانہ خطاب متاثر کن تھا۔ دوسرا لیکچر پروفیسر خورشید احمد کا تھا۔ خورشید بھائی کا تعلق سیوان سے ہے۔ ادبِ اردو کے نامور استاد اور فکشن کے چند ممتاز ناقدین میں سے ایک ہیں۔ وہ فراقؔ پر لیکچر دینے آئے تو ہم تھوڑے مایوس تھے مگر جب بولنے لگے تو ثابت کردیا کہ نقدِ شعر بھی ان کے لئے نامانوس میدان نہیں ہے۔ چائے کے وقفے میں خورشید بھائی تپاک سے ملے۔ گھر آنے کی دعوت دی۔ اس لطفِ خاص کی وجہ یہ تھی کہ دورانِ گفتگو میں نے رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سنا کر انھیں خوش کردیا تھا۔ آخری لیکچر پروفیسر آصف نعیم کا ''فارسی شاعری کی روایت اور اردو ادب پر اس کے اثرات'' کے موضوع پر تھا۔

پروفیسر آصف نعیم نے طبیعت خوش کردی۔ ہم ایران کے سبزہ زاروں سے ہندوستان کب پہنچے، پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ تو جب تقریر ختم ہوئی تو ہم ہوش میں آئے۔ لیکچرز کے خاتمے کے بعد بھائی صغیر افراہیم اور بہن سیما نے شام کی چائے پر آنے کی دعوت دے دی۔ شام کو میڈیکل کالونی پہنچے پُر تکلف چائے نوش کی۔ رات کے سوا نو بجے میڈیکل کالونی سے واپسی ہوئی۔ آج شہریار کی ساتویں سالگرہ کا دن تھا۔ اس کو فون پر مبارکباد دی۔ مبارکباد لینے کے بعد اس نے التجائیہ انداز میں گھر آنے کی بات کہہ کے رلا دیا۔ بیگم سے بہت ساری باتیں ہوئیں تو طبیعت ہلکی ہوئی۔ رات گئے تک اختر شاہ گجراتی سے احمد آباد اور گجرات میں اردو کی ترویج و اشاعت کی صورت حال پر گفتگو ہوتی رہی۔

۱۳ راپریل جمعہ کا دن گڈ فرائی ڈے کی چھٹی، ۱۴ راپریل بابا بھیم راؤ امبیڈکر کا یوم پیدائش اور ۱۵ راپریل اتوار۔ لہٰذا تین دنوں کی چھٹی کا فائدہ اُٹھانے کا بہت سارے لوگوں نے پروگرام بنا رکھا۔ غلام دستگیر عبدالغفور شیخ، اختر شاہ گجراتی، ابراہیم شیخ (جنھیں ہم سر کہتے تھے اس لئے کہ وہ ہمارے دو ساتھیوں اختر شاہ اور عابدہ نور محمد چندریگر کے استاد گرامی تھے) اور شولا پور کے ایک صاحب جن کا نام ذہن میں نہیں آرہا ہے، وہ فیزیکس کا ریفریشر کورس کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بریلی جانے کا پروگرام بنا رکھا، جہاں انہیں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے آستانے پر حاضری دینا تھی۔ اپنا کوئی پروگرام نہیں تھا، اس لئے نماز فجر کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔ ساڑھے سات بجے آنکھ کھلی۔ غسل وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ان چھٹی کے دنوں کو کیسے کام میں لائیں کہ ڈاکٹر شاہین، بنگلور والی فہیم النساء اور احمد آباد والی زیب النساء کے ساتھ کمرے میں آئیں۔ میں نے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو شاہین نے بتایا کہ شاہد بھائی! ایسا ہے کہ ان دونوں بیگمات کا اجمیر شریف کی زیارت کو جانے کا ارادہ ہے اور انہیں آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ اگر آپ ساتھ تشریف لے جائیں تو مہربانی ہوگی۔ طبیعت تو میری بھی مچل گئی مگر نہ جانے کیوں ذہن اس سفر پر آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے معذرت کی تو دونوں کی دل شکنی ہوئی مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔ چائے وائے پی، پھر کوثر اور مزمل تشریف لائے۔ ان سے ڈھیر ساری باتیں ہوئیں، پھر انہیں کے ہمراہ ہم لوگ جمعہ کی نماز کے لئے چل پڑے۔ یونیورسٹی کی جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ناظمِ شعبۂ سنی دینیات تقریر فرمارہے تھے۔ صاف ستھری تقریر، مسلکی معاملات کی جھلک بھی نہیں۔ سنت وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ نمازیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ننگے سر ہے اور پھر سلام پھیرے جانے کے بعد افراتفری کا ماحول بھی دیکھا۔ بیشتر افراد صفوں سے نکل نکل کر جارہے تھے۔ یہ وہ افراد تھے جو اجتماعی دعا کے قائل نہیں ہیں۔ دعا ہوئی پھر سنن اور نفل سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ خالی جگہوں کو دوسرے افراد بھرتے جارہے ہیں۔ پتہ چلا یہ شیعہ حضرات ہیں۔ سنیوں کی نماز کے بعد شیعوں کی جماعت قائم ہوتی ہے اور اس کی امامت ناظم شیعہ دینیات فرماتے ہیں۔ ہم مسجد کے احاطے میں سرسیّد، ان کے بیٹے سیّد محمود، سر راس مسعود اور مشہور

زمانہ وائس چانسلر سر ضیاء الدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھا اور دعا کی کہ مولا علی گڑھ کے صدقے میں تو سر سید کی مغرفت فرمادے۔ہم فاتحہ خوانی میں مشغول تھے، ادھر شعیوں کے امام نے تقریر شروع کر دی۔ پتہ چلا سر سیّد کے زمانے سے ہی اس مسجد میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ جامع مسجد یونیورسٹی کیمپس کی واحد مسجد نہیں ہے۔اس کے علاوہ مختلف ہالس میں مساجد ہیں جن کی تعداد چوبیس ہے۔ دیگر چوبیس مسجدوں کے امام کسی مسجد میں مستقل نہیں ہوتے۔ان کا تبادلہ ایک مسجد سے دوسری مسجد میں ہوتا رہتا ہے۔ جامع مسجد کی امامت ناظم دینیات کے لئے مخصوص ہے۔نماز کے بعد کوثر اور مزمل کو ساتھ لیتے آئے۔ دن کا کھانا ہم لوگوں نے ساتھ کھایا۔کوثر اور مزمل کو رخصت کیا تو ڈاکٹر شاہین، ڈاکٹر رقیہ جعفری کے ساتھ تشریف لائیں، پھر ہم لوگوں نے معین ہوسٹل کا رُخ کیا، جہاں ڈاکٹر شاہین اور ڈاکٹر رقیہ جعفری کو لینا اور ان کی سہیلیوں سے ملوانے کا دبیر احمد نے وعدہ کر رکھا تھا۔واپسی میں زوردار بارش نے گھیر لیا۔بھیگتے ہوئے قیام گاہ پر واپسی ہوئی۔شاہین نے زنانہ ونگ سے ہم لوگوں کے لئے کھانا بھجوایا۔آج دن سے پیٹ میں گرانی تھی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ دبیر صاحب کے ساتھ پونا کے ایوب بھائی جو غالباً جغرافیہ میں ریفریشر کر رہے تھے، ان کو کمرہ نمبر ۲۲ سے بلوا کر کھانا کھلایا۔ کمرہ ۱۸ میں ایک ہریانوی جاٹ تھے۔ان کے کمرے میں کمرہ ۲۰ کے گرمیت سنگھ اور ایس کے چماریا کی محفل روز جمتی تھی۔ان لوگوں نے مجھے ٹہلتا ہوا دیکھ کر پوچھا کہ اوئے سر جی! کیا بات ہے؟ میں نے بتایا کہ طبیعت تھوڑی صحیح نہیں ہے۔ وہ لوگ زبردستی مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ڈھیر سارے پھل کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔کہا ہم کھانے جا ہی رہے تھے۔ میں نے معذرت کرنا چاہی۔ان لوگوں نے یقین دلایا کہ ان پھلوں کے کھانے سے اگر آپ کی تکلیف بڑھ گئی تو ہمارا ذمہ۔میں نے کچھ پھل کھائے اور جلدی سے بھاگ کھڑا ہوا، اس لئے کہ گرمیت میرے سامنے بوتل کھولتے ہوئے شرما رہا تھا۔

۱۴ر اپریل بھی چھٹی کا دن تھا۔نو بجے کوثر چلے آئے۔ انہیں چائے پلائی گئی اور پھر قیام گاہ آ کر خط لکھنے میں لگ گئے۔ باہر جا کر دن کا کھانا کھایا اور پھر آفتاب چلے۔کوثر کی نیند خراب کی۔علی گڑھ کے طلبہ رات کے پچھلے پہر تک پڑھتے ہیں اور دن کے خالی اوقات میں جم کر سوتے ہیں مگر ہم بلائے بے درماں کی طرح پہنچ گئے۔ وہاں سے سینٹرل پوائنٹ کے لئے چل پڑے، جہاں آج بنجارہ ریستوراں میں ’بنجارہ میں سانجھ ڈھلے‘ کا ماہانہ پروگرام ہونے جا رہا تھا۔ بھائی ڈاکٹر صغیر افراہیم نے شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ ڈاکٹر دبیر اور میں نے پہلے رس ملائیاں کھائیں، پھر وہیں اس سڑک پر جو امیر نشاں تک جاتی ہے، ایک ٹیلہ نما اونچائی پر واقعہ تقریباً دوسو سالہ قدیم مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور پھر بنجارہ آئے، جہاں اردو ہندی کے شعرا اور ادبا پُر تکلف ناشتہ کے دوران سننا سنانا بھی ہو جاتا ہے۔اس سننے سنانے والے دور میں غضنفر (مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار، بہار آبائی وطن، علی گڑھ سے فراغت، لکھنؤ میں اُتر پردیش حکومت کی وزارتِ تعلیم کے ایک تحقیقاتی ادارے کے ڈائریکٹر) نے ’’رمی کا جوکر‘‘ سنایا جس میں ذات پات کی بنیاد پر سماج کو چھوٹے بڑے میں تقسیم کرنے کے ردِ عمل کے طور پر اس معاشرتی انتشار کا نقشہ پیش کیا تھا، جو دودھاری تلوار بن کر ہر طبقے کی شہ رگ کاٹ رہا ہے۔خاکسار نے تین ماہیئے اور ایک غزل سنانے کی جرأت کی۔ ڈاکٹر عارف حسین خاں (مردانہ وجاہت اور حسن و جمال کی آمیزش نے جن کو بہت دلکش بنا رکھا تھا اور اس دلکشی کو علمیت اور شرافت نے دو آتشہ بنا دیا تھا) نے چھ ماہیئے سنائے۔مشہور شاعر اور علی گڑھی تہذیب اور اخلاق کی منہ بولتی تصویر منظور ہاشمی نے نظم ’’گجرات ۲۰۰۱ء‘‘ سنائی۔پیش کردہ تخلیقات پر گفتگو ہوئی، پھر اچھی کافی پر نشست کا خاتمہ ہوا۔ڈاکٹر خالد سیف اللہ نے اپنی بائیک پر مجھے اور دبیر احمد کو اکاڈمک اسٹاف کالج چھوڑا۔ تھوڑی دیر بعد دبیر احمد نے پھر آفتاب چلنے کی ضد کی اور ہم لوگ کمرہ ۷۳ پہنچ گئے۔جمیل الرحمٰن سے علمی گفتگو کا سلسلہ رہا۔کوثر نے اچھی چائے پلائی۔ پرینکا میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ پونے بارہ بجے رات تک آفتاب میں رہے۔آج کی گفتگو میں ریاضی

کے ایک ریسرچ اسکالر خورشید بھی شامل ہو گئے جو سہسرام کے رہنے والے ہیں۔

۱۵/اپریل اتوار کا دن تھا۔ فجر کی نماز کے بعد دیر تک سونے کے ارادے سے لیٹے مگر ساڑھے سات بجے کمرے کی صفائی والا آ گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہین، نفیس بانو کے ساتھ آ گئیں۔ ادب معاشرت، تہذیب پر دیر تک بڑی پُر لطف گفتگو رہی۔ ہم لوگوں نے برش بھی نہیں کیا تھا۔ ان بیگمات کے جانے کے بعد فریش ہونے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر محبوب عالم، ڈاکٹر یعقوب یاور اور ڈاکٹر اختر شاہ چلے آئے۔ ساڑھے دس بجے تک ان حضرات کے ساتھ خوش گپیوں کا سلسلہ رہا، پھر کہیں غسل وغیرہ کا موقع ملا۔ شاہین چار کیلے ہمارے لئے چھوڑ گئیں تھیں۔ دو کیلے کھائے، پھر میاں اسرائیل دھامنگری چلے آئے۔ ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ مشہور حکیم انصاراللہ صاحب سے ملنے کا پروگرام کوثر کے نہیں آنے کی وجہ سے رد ہو گیا۔ دبیر صبح ہی امیرنشاں چلے گئے تھے۔ دو بجے آئے تو کھانا کھایا گیا، پھر غلط وقت پر آفتاب پہنچ کر ان لوگوں کی نیند خراب کی۔ شام کو کوثر، جمیل اور سلامت (یہ میاں ں سلامت مغربی اُتر پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ بینائی بہت کم ہے۔ ابتدائی تعلیم بریل کے سہارے حاصل کی۔ اس وقت سماجیات میں پی ایچ - ڈی کر رہے تھے، ہمارے رہتے ہوئے انہوں نے جے آر ایف بھی نکال لیا تھا) ہمارے ساتھ 'تصویر محل' تک آئے۔ چائے نوشی اور خوش گپیوں کے بعد انھیں رخصت کیا گیا۔ بہاری ہوٹل میں کھانا کھایا۔ (طیبہ کالج کی دیوار سے لگا یونیورسٹی روڈ پر واقع یہ ہوٹل سستا بھی تھا اور بہت لذیذ بہاری کھانے کھلاتا تھا) اور سویرے سونے کی تیاری میں لگ گئے۔

۱۶/اپریل کی صبح بھی اور صبحوں کی طرح آئی مگر آج اکاڈمک اسٹاف کالج کا دن یادگار رہا۔ پہلا لیکچر مشہور محقق اور اردو کے نامور ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا تھا۔ قاسمی صاحب کا تعلق بہار کے ضلع دربھنگہ سے ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی پگڑی باندھنے کے بعد علی گڑھ کا رُخ کیا۔ اردو ادب میں ایم اے کیا۔ پی ایچ - ڈی کی ڈگری لی۔ شعبۂ اردو میں تدریس سے لگے اور خداداد صلاحیتوں کے برتے بڑا نام کمایا۔ علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ میں یکساں مقبولیت کے حامل ہیں۔ نام میں قاسمی کا جزو ہی مدرسہ بیک گراؤنڈ کا ثبوت ہے اور دوسری کوئی نشانی نہیں ملتی۔ خوش لباس بھی ہیں، جامہ زیب بھی۔ کار پر سفر کرتے ہیں اور ڈرائیو بھی خود کرتے ہیں۔ بیگم دردانہ قاسمی بھی یونیورسٹی میں تدریس سے جڑی ہوئی ہیں اور کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ قاسمی صاحب لیکچر دینے آئے ''اردو شاعری اور تصوف'' کے موضوع پر بولتے چلے گئے۔ تقریر میں آبشار کا ترنم بھی تھا اور روانی بھی اور فلسفۂ وحدت الوجود کے سلسلے میں میری بہت ساری الجھنیں خود بخود سلجھتی چلی گئیں۔ چائے کے وقفہ کے بعد دوسرا لیکچر ڈاکٹر عقیل احمد کا تھا۔ آپ کی بیگم نیلم فرزانہ ہمارے ساتھ ریفریشر میں موجود تھیں، اس لئے ہم سب سے ان کا رشتہ بن رہا تھا۔ ہم تھوڑے مذاق کے موڈ میں تھے مگر عقیل صاحب نے نظم کی تنقید پر گفتگو شروع کی تو ہمیں بہائے لئے چلے گئے۔ نظم کا ارتقائی سفر، اس کی مختلف ہیئتیں اور مختلف تحریکات کے زیرِ اثر اس میں آنے والی تبدیلیاں بہت خوب لیکچر رہا۔ چائے کے دوسرے وقفہ کے بعد پہلے دن والے بزرگ پروفیسر نورالحسن نقوی تشریف لائے۔ ''اقبال، فن اور فلسفہ'' ان کا موضوع تھا۔ فن پر گفتگو کرتے کرتے پورا لیکچر ختم ہو گیا۔ فلسفے پر بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہم نے بھائی صغیر افراہیم صاحب سے گذارش کہ اگر کوئی ریسورس پرسن غیر حاضر ہو تو نقوی صاحب کو اقبال کے فلسفے پر بولنے کو ضرور کہا جائے مگر یہ موقع ہاتھ نہیں آ سکا۔ دن کا کھانا بہاری ہوٹل میں کھانے کے بعد پوسٹ آفس کا رُخ کیا۔ کچھ ضروری خطوط ارسال کرنا تھے۔ شام کو مغرب بعد حسب معمول آفتاب کا رُخ کیا۔ آسمان پر گھنیرے بادلوں کے جماؤ نے مجبور کیا کہ پرینکا میں کھانا کھا کر بھاگ کھڑے ہوں۔ بھاگتے بھاگتے بھی بارش نے گھیر ہی لیا، بھیگ گئے۔ کپڑے تبدیل کر کے لیٹے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ موسم نے طبیعت کی تہہ میں بیٹھی ہوئی موجوں کو سطح پر لا دیا تھا۔ اس کیفیت کی ترجمانی یہ شعر کر رہا تھا :

ایک بھیگی ہوئی شام کو دہلیز پہ بیٹھے
ہم دل کے سلگنے کا سبب پوچھ رہے ہیں

رات جم کر بارش ہوئی تھی۔علی گڑھ، دہلی وغیرہ میں تپتی ہوئی گرمی میں بھی بارش ہو جائے تو موسم سرد ہو جاتا ہے۔فجر کی نماز با جماعت نہیں ہو سکی۔سب نے انفرادی نمازیں ہی پڑھیں۔آج ۱۷/اپریل بڑے بیٹے صوفی ظفر کی سالگرہ کی تاریخ۔سوچا تھا کہ صبح ہی فون کر کے اسے برتھ ڈے وِش کر لیں گے مگر صبح کی دیگر مصروفیات میں لیکچرز کا وقت ہو گیا۔پہلا لیکچر پروفیسر عتیق احمد صدیقی کا تھا۔بزرگ اور نامور شخصیت کئی کتابوں کے مصنف۔''سودؔا کے قصائد'' پر عالمانہ لیکچر دیا۔دوسرا لیکچر ڈاکٹر شہپر رسول، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تھا۔شہپر رسول ہمعصر اردو شاعری کا اہم نام ہے۔ان کی فراغت بھی علی گڑھ کی ہے۔''اردو قطعہ گوئی کی روایت'' پر بڑا مفید لیکچر دیا۔میں نے ان کی توجہ اعزاز افضل کی قطعات نگاری کی طرف دلائی اور افضل صاحب کے چار پانچ قطعات سنائے۔شہپر رسول صاحب نے اس بات کے لئے شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کو اُردو کے ایک اہم قطعہ نگار سے واقف کرایا۔چائے نوشی کے وقفے کے بعد شہپر رسول نے ''اختر انصاری کی قطعات نگاری'' پر اپنا دوسرا خطبہ دیا اور موضوع کا حق ادا کر دیا۔آج شام منظور ہاشمی کے دولت کدے پر ادبی نشست کا اہتمام تھا۔اکاڈمک اسٹاف کالج کی گاڑی ہمیں لینے آئی۔کچھ لوگوں نے آرام کو ترجیح دی تو کچھ لوگوں نے دوسری مصروفیات کو۔پھر بھی شرکاء(Participants) کی اچھی تعداد نے بدر باغ میں منظور ہاشمی کی بزم کی رونق بڑھائی۔منظور ہاشمی نے ہم لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر شہپر رسول، شہاب الدین ثاقب، مغل فاروق پرواز اور اپنے چند خاص دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔پُر تکلف ناشتے کے بعد اردو تنقید کی صورت حال پر مباحثہ ہوا۔مباحثے کا آغاز ڈاکٹر صغیر افراہیم نے کیا۔مباحثے میں یعقوب یاور، معین الدین جینا بڑے، شہزادا نجم، منظور ہاشمی، مغل فاروق اور اس ناچیز نے حصہ لیا، پھر شعری دور شروع ہوا جس میں شہاب الدین ثاقب، شہپر رسول، یعقوب یاور، تحریر انجم، منظور ہاشمی اور مغل فاروق پرواز کے علاوہ خاکسار نے دو ترو ینی اور ایک غزل سنا کر حصہ لیا۔صغیر افراہیم کی گاڑی نے آفتاب ہال کے مغربی دروازے پر نو بج کر پچیس منٹ پر مجھے چھوڑا۔میں فون کی طرف بھاگا۔بیٹے کو سالگرہ کی مبارکباد دی۔بیگم اور گھر میں موجود دیگر عزیزوں سے باتیں ہوئیں۔تینوں بیٹیوں غزالہ، کائنات اور رخشندہ اور دونوں چھوٹے بچوں شہریار اور شاہکار سے دیر تک باتیں ہوئیں۔آفتاب کے کمرہ ۳۷ میں میرا انتظار ہو رہا تھا۔وہیں کھانا منگوایا گیا۔کوئی ساڑھے بارہ بجے قیام گاہ واپسی ہوئی۔

آج قیام گاہ پہنچنے پر ایک ایسی بات ہوئی جو یادگار ہو گئی۔ہم لوگوں کے پہنچنے پر حسبِ معمول نائٹ گارڈ نے اُٹھ کر سلام کیا۔ہر شب ایک نئے نائٹ گارڈ سے سامنا ہوتا۔آج جو نائٹ گارڈ تھے، وہ سانولی رنگت اور نکلتے ہوئے قد کے ادھیڑ عمر تھے۔سلام و دعا میں ہی ہم نے نوٹس کیا کہ مچھروں نے ان کے گرد ہالہ بنا رکھا ہے اور ان کی حرکات وسکنات کے ساتھ وہ ہالہ منتشر یا مجتمع ہو رہا ہے۔میں نے از راہِ ہمدردی کہا کہ یقینی طور پر صبح تک مچھر آپ کو اُٹھا لے جائیں گے۔میری اس بات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا، اس کا لطف آپ بھی اُٹھایئے۔انہوں نے کہا :

''میاں! علی گڑھ کے مچھروں کی تو پوچھئے ہی مت۔اگر شہد کے چھتوں میں مکھیوں کی جگہ مچھر لگتے تو علی گڑھ میں شہد چار آنے کلو بکتا۔''

دوآبۂ گنگ وجمن کا ایک عام کم پڑھا لکھا آدمی بھی ایسی مرصع زبان بول سکتا ہے، ہم ان کے اس جملے کو دل میں سنبھالے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

۱۸/اپریل کو تین میں سے پہلا لیکچر ظفر احمد صدیقی کا تھا۔ظفر صاحب کے تعلق سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ مولویانہ وضع قطع کے آدمی ہیں۔ان کا شمار شعبۂ اردو کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے،جنہیں شعبے کی ناک کہتے ہیں۔انتہائی شریف اور نرم گفتار۔۱۱/اپریل کو عربی ،فارسی اور اردو کے حوالے سے صنفِ قصیدہ کے ارتقاء پر ان کا شاندار لیکچر ہوا تھا۔آج کلاسیکی غزل پر بولنے آئے۔طبیعت تھوڑی مضمحل تھی، پھر بھی اوقاتِ مقررہ میں تبدیلی لائے بغیر بولتے چلے گئے۔دوسرا لیکچر پروفیسر انصار اللہ کا تھا۔ان کو''قطب شاہی دور میں اردو کی اہم اصنافِ شاعری'' کا موضوع دیا گیا تھا۔خالص تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔محققانہ گفتگو کی خشکی کے باوجود ان کی تقریر سے توجہ ہٹانے کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔تیسرا لیکچر سیّد محمد ہاشم کا تھا۔''قصیدہ کی تدریس'' پر اچھی اور کامیاب گفتگو کی۔لیکچر کا باڈی لینگویج بھی خوب تھا۔شام اسی خرابے میں گزری، جسے مسلم یونیورسٹی کہتے ہیں۔

۱۹/اپریل کو پہلے دو لیکچرز پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے تھے۔پروفیسر صاحب اردو کے نامور مصنفین میں سے ایک ہیں۔بیرونِ ملک بھی تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔''حسرت کی شاعری'' پر گفتگو بڑی رنگین رہی۔چائے کا وقفہ طویل ہوا، پھر دوسرا لیکچر''مثنوی سحر البیان اور گلزارِ نسیم'' کے عنوان سے تھا۔موضوع پر تھوڑی گفتگو کے بعد ہم لوگوں کے اصرار پر قاضی صاحب نے ماسکو اور تاشقند کے زمانۂ قیام کے کچھ واقعات سنائے۔تیسرا لیکچر قاضی جمال حسین کا مجید امجد کی شاعری پر تھا۔قاضی جمال حسین نے رنگ جما دیا۔مقررہ وقت سے زیادہ بول گئے، پھر بھی وقت کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔شام کو آفتاب میں مولانا افتخار سے ملاقات ہوئی۔یہ حضرت گورکھپور کے ہیں۔کیمپس کی چوبیس مسجدوں میں سے ایک کے امام ہیں اور جمیل الرحمٰن کے اچھے دوستوں میں ہیں۔دورانِ گفتگو آج کی قاضی جمال حسین صاحب کی گفتگو کی بات نکلی تو مولانا، جو قاضی صاحب کے ہم وطن ہیں، نے بتایا کہ قاضی جمال نے مدرسہ کی عالمیت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنا کیریئر مسجد میں امامت سے شروع کیا۔ان کو امام کی حیثیت میں پا کر ان کے ایک استاد (جو ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے) نے پھبتی کسی۔اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے امامت سے استعفیٰ دیا۔علی گڑھ آئے، داخلہ لیا اور آج شعبۂ اُردو کے قابل قدر اساتذہ میں سے ایک ہیں۔رات کا کھانا پرینکا سے منگوا کر ہم سب نے کھایا۔گرما گرم بحث کی اور رات کے بارہ بجے قیام گاہ لوٹے۔

۲۰/اپریل کی صبح نسبتاً خراب گذری۔پروفیسر عتیق اللہ کے دو لیکچرز تھے مگر حضرت تشریف نہیں لا سکے۔پتہ چلا ٹرین میں اتنی گہری نیند آ گئی تھی کہ دہلی پہنچ کر ہی بیدار ہوئے۔وہاں پہنچ کر فون کیا اور آنے سے اس لئے قاصر رہے کہ اس وقت علی گڑھ کے لئے کوئی دوسری ٹرین دستیاب نہیں تھی۔ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر زاہد حسین سے مشورے کے بعد اعلان کیا کہ اسٹاف کالج کی گاڑی ہمیں فیکلٹی کی سیر کرانے کے لئے لے جائے گی اور اس کے عوض ہمیں دو حاضریاں مل جائیں گی۔اسٹاف کالج کی گاڑی ہمیں فیکلٹی تک لے گئی تو پتہ چلا کہ اندر امتحانات کی وجہ سے ہمارا داخلہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ہم سب کا موڈ بگڑ گیا۔ہم نے کچھ جلی کٹی بھی سنائیں۔ہمیں لائبریری لے جانے کی بات کی گئی تو اس قافلے سے شہزاد انجم، دبیر احمد اور میں نے علیحدگی اختیار کی۔کینٹین میں چائے پی۔اپنے گھر لوٹے اور یعقوب یاور کے کمرے میں بارہ بجے تک محفل جمائی۔پھر جمعہ کی نماز کے لئے یونیورسٹی کی جامع مسجد پہنچے۔وہاں جمعہ کی نماز میں سلام کے بعد افراتفری کا ماحول دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔اجتماعی دعا کے قائل نہ سہی، آدابِ محفل کا قائل تو انہیں ہونا ہی چاہئے۔جمعہ کی نماز میں اجتماع کا تصور ہی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔نماز پڑھ کر باہر آئے تو رشٹرا کے ایک لڑکے سے اچانک ملاقات ہو گئی۔وہ لڑکا ایک زمانے میں میرے بہت قریب تھا، پھر علی گڑھ چلا گیا۔ان دنوں پی ایچ-ڈی کے کام کے علاوہ وہ ایک پبلشنگ ادارے سے وابستہ ہے۔اس لڑکے کا نام میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔شرم سے

میں اس کا نام نہیں پوچھ سکا۔ اس نے اپنے ہوسٹل والے کمرے میں آنے کی دعوت دی، جسے میں نے قبول تو کرلیا مگر اس سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کرسکا۔ دن کا کھانا آفتاب میں کھا کر قیام گاہ لوٹے، اس لئے کہ آج ڈاکٹر صغیر افراہیم اور پروفیسر خورشید احمد کی مشترکہ میزبانی میں اکاڈمک اسٹاف کالج میں ایک رنگین شام کا اہتمام ہونے جا رہا تھا۔ مغرب بعد تقریب شروع ہوئی۔ خورشید بھائی نے خیر مقدمی کلمات سے نوازا، پھر تقریب نثری اور شعری دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ نثری تقریب معین الدین جینا بڑے کی صدارت اور شہزاد انجم کی نظامت میں شروع ہوئی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر مظہر مہدی نے کیا۔ انہوں نے سردار جعفری کے فن پر ایک بسیط مقالہ پیش کیا۔ ان کے بعد نسرین مرزا نے افسانہ ''عرفان'' سنایا جبکہ نفیس بانو نے اپنا افسانہ ''گلبن'' پڑھ کر سنایا۔ دونوں افسانے مواد، ہیئت اور پیشکش کے اعتبار سے توجہ سے سنے گئے اور پسند بھی کئے گئے یعقوب یاور نے اپنے ناول 'عزازیل' کا ایک باب پڑھ کر سنایا۔ آخر میں صدر جلسہ معین الدین جینا بڑے نے اپنا مشہور افسانہ ''برسو رام دھڑاکے سے'' پڑھ کر سنایا۔ شہزاد انجم کی نظامت نے نثری دور کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔ پھر شعری دور شروع ہوا۔ کرسیٔ صدارت پر یعقوب یاور جلوہ گر ہوئے۔ نظامت کا بار مجھ ناتواں پر آپڑا۔ اس دور میں مس انوپم سریواستو، ڈاکٹر حامد اشرف، ڈاکٹر وحید کوثر، ڈاکٹر غلام دستگیر غلام، ڈاکٹر نفیس بانو، ڈاکٹر اختر مرزا، ڈاکٹر تحریر انجم، ڈاکٹر انعام الحق انعام ناظمی، ڈاکٹر سراج اجملی اور صدرِ بزم یعقوب یاور نے اپنے کلام سے شعری دور کو یادگار بنا دیا۔ میں نے نقابت کے علاوہ دو ماہیئے، ایک ترو ینی، ایک نظم اطمینان اور ایک غزل سنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ ساڑھے دس بجے تقریب کے اختتام پر کھانے کی دوڑ شروع ہوئی۔ ہم لوگ رکشا سے شمشاد پہنچے، جہاں ایک ہوٹل میں بمشکل تمام بھوک مٹانے کا انتظام ہوسکا۔ ساڑھے بارہ بجے کوثر جمیل اور دوسرے بچوں کے ساتھ چائے پی گئی۔ آپ کو حیرت ہورہی ہوگی کہ ساڑھے بارہ بجے رات کو چائے نوشی چہ معنی دارد۔ مگر بھائیو! علی گڑھ کا یونیورسٹی کیمپس دو بجے رات کو بھی شام سات بجے کا نظارہ پیش کرتا ہے۔

آج کی شام اکاڈمک اسٹاف کالج کی رنگین اور یادگار شام تھی تو علی گڑھ والوں کیلئے بھی یہ شام ناقابلِ فراموش بن گئی تھی اس لئے کہ آج پروفیسر سیّد ظل الرحمٰن کے تجارا ہاؤس (Tijara House) میں جناب حامد انصاری، وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جناب سراج حسین، وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، ڈاکٹر روحی صفت، کاؤنسلر، ایران سفارت خانہ، دہلی، ڈاکٹر تقی رفیع (ایران کلچرل ہاؤس) اور سینکڑوں صاحبانِ علم و دانش کی کہکشاں اُتر آئی تھی اور آج سیّد ظل الرحمٰن صاحب کی چالیس سالہ ریاضت ''ابن سینا اکاڈمی آف میڈیویل میڈیسن'' کے افتتاح کی صورت میں ثمر بار ہورہی تھی۔ ہم اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کی زنجیروں میں بندھے ہونے کی وجہ سے اس افتتاحی تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں کرسکے۔ ڈاکٹر خالد سیف اللہ سے (جن کے توسط سے اس تقریب کی دعوت ہمیں موصول ہوئی تھی) ہم نے معذرت چاہی مگر ان سے یہ وعدہ لینے میں کامیاب رہے کہ وہ کسی اور دن ہمیں ابن سینا اکاڈمی کی زیارت کرائیں گے۔

۲۱/اپریل بروز ہفتہ پہلا لیکچر عارف حسن خاں کا ایہام گوئی پر تھا۔ ان کے تعلق سے پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ علی گڑھ کے فارغین میں سے ہیں۔ مراد آباد کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ بہت دلکش شخصیت کے مالک، خوش لباس اور خوش گفتار ہیں۔ ایہام گوئی پر جم کر گفتگو کی، پھر چائے کے وقفہ کے بعد مشہور ناقد اور محقق پروفیسر شمیم حنفی نے اردو میں طویل نظم کی روایت پر عالمانہ گفتگو کی۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کو طویل ترین داستانوں اور طویل ترین نظموں کا تحفہ مشرق نے دیا ہے اور مشرق میں طویل نظموں کے جواز پر ان کی خطابت نے سماں باندھ دیا۔ دورانِ گفتگو انہوں نے جون ایلیا کا ایک بڑا خوبصورت سا شعر سنایا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا :

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

چائے کے وقفے میں شمیم صاحب سے گفتگو کی صورت نہیں نکل سکی، اس لئے کہ یونیورسٹی کے چند سینئر اساتذہ شمیم صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ چائے کے وقفہ کے بعد ''علامتی نظم'' کے عنوان سے ایک اور مفید گفتگو رکھی۔ پورا ہال ان کی گفتگو کے بہاؤ میں بہا جارہا تھا۔ آج کی رات میرے روم پارٹنر نے ہوسٹل میں گزاری، کل صبح تڑکے انہیں دہلی کیلئے روانہ ہونا ہے۔

۲۲/اپریل، اتوار کا دن نماز فجر کے بعد جم کر سوئے حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد ابھی سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ کیا کیا جائے، جب تک پڑوس کے ہریانوی بھائی نے دروازہ کھٹکھٹایا ''اوئے سر جی! آپ کو لیڈیز سائڈ سے پکارا جار ہا ہے۔'' گیا تو پتہ چلا کہ شولا پور والی مومنہ کے شوہر تشریف لائے ہوئے ہیں۔ رات ان لوگوں نے کسی ہوٹل میں قیام کیا۔ آج تڑکے انہیں آگرہ کے لئے نکلنا تھا مگر چار بجے صبح سے مومنہ کے میاں شدید پیٹ درد کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ مومنہ نے عقلمندی یہ کی ہے کہ ہوٹل سے سراج صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر اسٹاف کالج چلی آئی ہے۔ مومنہ بس رو رہی تھی۔ ہم نے اسے تسلّی والی ڈانٹ پلائی، فوراً ڈاکٹر بلوایا۔ دوائیں لائیں اور اپنے کمرے میں لاکر دبیر احمد کے خالی بستر پر انہیں لٹا دیا اور اپنا بیڈ مومنہ کے حوالے کیا اور کہا کہ آس پاس کے کسی کمرے میں موجود رہوں گا۔ کسی بھی ضرورت کے لئے آواز دے لینا۔ پھر مختلف کمروں میں خوش گپیوں اور دھما چوکڑیوں کا سلسلہ رہا۔ معین الدین جینا بڑے اور ان کے روم پارٹنر اشتیاق اعظمی کے ساتھ وقت کچھ زیادہ ہی خوشگوار کٹا۔ شام کو قمر الہدیٰ فریدی تشریف لائے۔ انہیں لے کر تصویر محل آئے۔ چائے پی، دیر تک گفتگو کا سلسلہ رہا۔ اپنا کمرہ چونکہ مومنہ اور سراج کے لئے وقت تھا، اس لئے آج انعام الحق کے کمرے میں شب بسری کا انتظام کیا۔ ان کے پارٹنر شہزاد انجم بھی دہلی گئے ہوئے تھے۔ انعام الحق (انعام ناظمی) انتہائی خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ کسی کی بھی تکلیف ہو، انہیں اپنی لگتی ہے۔ دوسروں کے کام آنا ان کے لئے فخر اور شادمانی کی بات ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مقبول ہیں۔ یہاں کی چند ہفتوں والی ملاقات میں وہ اس طرح دل میں سما چکے ہیں کہ لگتا ہے سالہا سال کا ساتھ ہے۔ ان کے کمرے میں اکثر ان کے نواح کے ان لڑکوں کا تانتا رہتا ہے جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ یعنی یہ کہ یہ چشمۂ فیض جس طرح سہسرام اور ڈہری اون سون میں جاری رہتا ہے، علی گڑھ میں بھی جاری وساری ہے۔ اللہ انعام الحق کی عمر دراز کرے۔ آج کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

۲۳/اپریل دوشنبہ کو عارف حسن خاں کے دو لیکچرز کا پروگرام تھا۔ پہلے لیکچر کا موضوع تھا: ''غزلیاتِ میر میں عروض و آہنگ کا شعور'' اور دوسرے کا ''رباعی کے اوزان''۔ خاں صاحب نے ایسے خشک موضوعات پر ایسی دلپذیر گفتگو کی بس سماں باندھ دیا۔ انہوں نے درس کی جدید تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے سلولائڈ کی مدد سے عروضی گتھیاں سلجھائیں اور اپنی عروضی بحثوں کی زیروکس کاپیاں بھی عنایت کیں۔ تیسرا لیکچر ''رباعیاتِ فراق'' پر پروفیسر ابوالحسنات حقی کا تھا۔ حقی صاحب تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں موضوع کا احاطہ کر کے فرصت دے دی۔ دن کا کھانا کھا کر خطوط لکھے، آرام کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یونیورسٹی کینٹین پر ہلّہ بول دیا، پھر چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی مولانا آزاد لائبریری میں گھس پڑے۔ لائبریری میں مشہور مؤرخ پروفیسر عرفان حبیب کو اس حال میں دیکھا کہ ان کا ایک پاؤں زمین پر ہے اور دوسرا ایک کرسی پر۔ ہاتھ میں کھلی ہوئی کتاب ہے۔ انہماک کا یہ عالم ہے کہ آس پاس کی آواز سے بھی ڈسٹرب نہیں ہو رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ حضرت کے مطالعے کا یہی حال ہے۔ اگر ذوق کی چیز مل گئی اور پڑھنا شروع کر دیا تو یہ ہوش نہیں رہتا کہ کس حال میں

ہیں۔ بتانے والے نے بتایا کہ اگر ہم دو گھنٹے بعد بھی آئیں گے تو انہیں اسی حال میں دیکھیں گے اگر اسی کتاب کو پڑھ رہے ہوں۔

۲۴/اپریل کو پروفیسر ابوالکلام قاسمی ''اقبال کی شاعرانہ عظمت'' پر بولنے آئے۔ قاسمی صاحب جس موضوع پر بولتے ہیں، بولنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اقبال ہمارے مطالعے میں عرصہ دراز سے ہیں۔ ان پر بہت ساری کتابیں بھی پڑھ رکھی ہیں مگر قاسمی صاحب کے لیکچر کے دوران اقبال کی از سر نو بازیافت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے دوران گفتگو فیض کا اقبال سے موازنہ کر دیا تو ان کی تیوری پہ بل آ گئے مگر فوراً ہی خوشگوار موڈ میں آ گئے۔ دوسرا لیکچر ہمارے عہد کے بہت بڑے شاعر شہریار کا تھا۔ ان کا موضوع تھا ''جدید غزل''۔ سامنے ملکِ غزل کے شہریار تھے اور ہمیں فراقؔ یاد آ رہے تھے :

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

ہماری اکثریت ان سے باتیں کرنے اور ان غزلیں سننے کے موڈ میں تھی۔ ہمارے جذبات و احساسات کی قدر کرتے ہوئے شہریار صاحب جدید غزل کے تعلق سے چند مفید باتیں کرنے کے بعد ہم سے ڈھیر ساری باتیں اور اپنی تین غزلیں اور دو نظمیں سنا کر ہمیں ازخود رفتہ کر دیا۔ تیسرا لیکچر کانپور کے مشہور حلیم کالج کے پرنسپل پروفیسر ابوالحسنات حقی کا تھا۔ ان کا موضوع ''جگت موہن لال رواں کی رباعیاں'' تھا۔ پروفیسر صاحب نے ناسازیٔ طبیعت کے باوجود علی گڑھ آنے کی زحمت کی تھی۔ آج بھی ان کی طبیعت ان کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہم نے ان سے بہت ساری باتیں کر کے اور ان سے انکی دو تین غزلیں سن کر کسی حد تک ان کی کسل مندی دور کر دی۔ بعد نمازِ عصر کوثر اور جمیل الرحمٰن نے ہماری کٹیا کی قسمت چمکائی۔ بعد نمازِ مغرب تصویر محل میں چائے پی گئی اور ٹہلتے ہوئے آفتاب ہوسٹل پہنچے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا۔ آفتاب کی لائبریری دیکھی اور بیت بازی کی محفل سے محظوظ ہوئے۔

۲۵/اپریل کو فجر کے بعد لیٹے تو تھوڑی دیر بعد تیز آوازوں نے نیند خراب کر دی۔ باہر نکلے تو پتہ چلا کہ بندروں نے اور دنوں کے مقابلے میں آج زیادہ ہی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ پونا والے ایوب بھائی اور ہریانہ والے ایس کے چماریا کے کپڑے بندروں نے چیتھڑوں میں تبدیل کر دیئے ہیں۔ یوں تو روزانہ باہر پھیلائی ہوئی کسی کی لنگی، کسی کی بنیان بندروں کی تفریح کی نذر ہو جاتی ہے مگر آج وہ تفریحی موڈ میں نہیں ہیں بلکہ مرنے مارنے والے موڈ میں نظر آ رہے ہیں اور انہوں نے مستورات کے ہوسٹل کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ ادھر سے مدد کے لئے پکارا جا رہا ہے ادھر سے تسلیاں دی جا رہی ہیں۔ درمیان میں دربان رفیق اپنے قد سے دوگنی اونچائی والا بانس لئے ادھر سے ادھر دوڑ رہا ہے اور چیخ چیخ کر ہمیں ہمارے کمروں میں جانے کی التجا کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد معاملہ پرسکون ہوا تو سب باہر نکلے۔ معاملہ یہ تھا کہ ایک بندر کا بچہ زنانہ ٹوائلٹ کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر چلا گیا۔ دروازہ کھلا دیکھ کسی نے باہر سے بند کر دیا۔ بچے نے اپنے محصور ہونے کی اطلاع اپنی آواز میں دی تو سارا قبیلہ اس کی مدد کو دوڑ پڑا۔ ان کی نقل و حرکت سے رفیق نے اندازہ لگا کر ٹوائلٹ کا دروازہ کسی طرح کھول دیا۔ بچے کا سلامت واپس آنا تھا کہ بندروں نے اپنی ناکہ بندی ختم کر دی۔ مذاق کا ایک موضوع ہاتھ آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہنسی مذاق کا ماحول رہا، پھر سب اپنی اپنی تیاریوں میں لگے گئے۔ آج پہلا لیکچر فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر ڈاکٹر عقیل احمد کا تھا۔ عقیل بھائی ویل ریڈ آدمی ہیں۔ اس سے پہلے بھی اپنے مطالعے کی وسعت سے متاثر کر چکے تھے۔ آج بھی بڑی اچھی گفتگو کی۔ چائے کے وقفہ میں کسی نے بتایا کہ قاسمی صاحب اور قاضی جمال حسین کی طرح عقیل بھائی بھی مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کا لُک اس بات کی تردید کرتا ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ نیلم سے پوچھ لیں گے، پھر بھول

گئے ۔ پانچ سال بعد ان سطور کے لکھتے وقت افسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے پاس تو ایک آتھینٹک سورس تھا، پھر ہم اس کی تصدیق یا تردید کیوں نہیں کرا سکے۔ دوسرا لیکچر مگدھ یونیورسٹی کے پروفیسر، بہت بڑے افسانہ نگار اور ادبی اور غیر ادبی ہر قسم کے موضوعات پر لکھتے رہنے اور چھپتے رہنے والے جناب حسین الحق کا ''حمد و مناجات'' کے موضوع پر تھا۔ میں نے ان کے افسانوں کے علاوہ ان کے ان مضامین کو بھی پڑھنے کی سعادت حاصل کر رکھی تھی جو ماہنامہ ''الکوثر'' (سہسرام) کے علمی مباحث والے کالم میں چھپے تھے۔ مطالعہ اور تجربہ دونوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے گفتگو کو پُر تاثیر بنائے رکھا۔ تیسرا اور آخری لیکچر پروفیسر عبدالباری شبنم کا ''حالؔی اور غزل'' کے عنوان سے ہوا۔ گفتگو کے آغاز میں ہی میں نے حالؔی کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر سنا کر ان کا موڈ بنا دیا :

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

جم کر بولے اور اچھا بولے۔ آج شام یونیورسٹی کیمپس نکلنے کی طبیعت نہیں چاہی۔ ڈاکٹر اشتیاق اعظمی آ گئے۔ بڑی مفید علمی گفتگو رہی۔ اشتیاق اعظمی جون پور کے محمد حسن پوسٹ گریجویٹ کالج میں اردو کے صدر شعبہ اور کالج کے وائس پرنسپل بھی ہیں۔ پی ایچ - ڈی کی ڈگری رکھتے تھے۔ کل ہی ڈی لٹ پانے کی خوشخبری بھی مل گئی۔ جوان آدمی ہیں۔ جے.این.یو کے فارغ ہیں۔ ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اشعار بہت یاد ہیں۔ معین الدین جینا بڑے کے روم میٹ ہیں۔ ان دو دیوانوں کی خوب گزرتی ہے۔ دبیر احمد آئے تو ہم تینوں رات کا کھانا کھانے باہر نکلے۔ تصویر محل سے آگے والی سڑک پر حکیم انصار اللہ کے مطب کے قریب والے بوتھ سے ایک عزیز کے گھر فون کر کے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کی تو اطمینان ہوا۔ تین دنوں سے گھر کا فون خراب ہونے کی وجہ سے خیریت معلوم نہیں ہو سکی تھی تو طبیعت اُچاٹ ہوئی جا رہی تھی۔ آج اطمینان ہوا۔ یہ بی ایس این ایل کے ملازمین سرکاری روٹی مفت میں توڑتے ہیں اور صارفین کو پریشان کرتے ہیں۔

۲۶/اپریل کی صبح ٹھیک ٹھاک رہی۔ لوگ بندروں کے کل کے رویے کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے مگر آج بندروں کی ٹولی معمول کے مطابق اُچھل کود کر رہی تھی۔ کل کے واقعے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا۔ انسان ہوتے تو انتقام لینے کی سوچتے یا دل میں کینہ پالتے۔ آج لیکچر شروع ہونے سے قبل پروفیسر حسین الحق سے ڈائریکٹر کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ خندہ پیشانی اور بزرگانہ شفقت سے پیش آئے اور کبھی فرصت میں گیا پہنچنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ حسین الحق صاحب ہمارے شہزاد انجم کے استاذِ گرامی بھی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی وہ ہم لوگوں کے لئے قابلِ احترام تھے۔ آج انہوں نے دبستانِ عظیم آباد کے موضوع پر گفتگو کی۔ موضوع ان کا اپنا تھا، اس لئے اس کا حق ان سے بہتر اور کون ادا کر سکتا تھا۔ دوسرا لیکچر جے پور یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر فیروز احمد کا تھا۔ موضوع تھا ''دکنی غزل گوئی'' اچھی گفتگو کی۔ میرے اُٹھائے گئے سوالات کو انہوں نے Appreciate کیا۔ تیسرا لیکچر ''نظمِ جدید کی تحریک'' کے عنوان سے پروفیسر عبدالباری شبنم ان کی گفتگو بھی بہت موثر اور قابلِ توجہ رہی۔ مغرب کی نماز کے بعد اشتیاق اعظمی کے ساتھ چائے پی اور آفتاب پہنچے۔ کوثر، جمیل الرحمٰن اور نور الزماں (جنہیں کوثر کا پورا گروپ ماسٹر صاحب کہتا ہے) اور مراد آباد سے تشریف لائے ہوئے ایک مہمان سے ملاقات ہوئی۔ سلطان جہاں کے سامنے چائے پی گئی اور واپسی میں ڈائننگ ہال کا کھانا کھایا گیا۔ یونیورسٹی کا یہ ڈائننگ ہال مولانا آزاد لائبریری سے متصل ہے۔ سبسیڈائزڈ ہے اور سیلف ہیلپ سسٹم رکھتا ہے۔ کھانے کی کوالیٹی بہت عمدہ ہے۔ ماشاءاللہ گھر کا فون آج بھی خراب ہے۔ دوسرے محلے میں اپنے منجھلے بھائی کے گھر فون کیا تو پتہ چلا کہ میرے محلے میں دھماکہ ہوا ہے۔ مغربی بنگال اسمبلی انتخابات قریب آ رہے ہیں۔ سیاسی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔ ساتھ ہی بم سازی اور بم بازی کا

سلسلہ بھی دراز ہو رہا ہے۔اللہ کرے امن و امان قائم رہے۔

۲۷؍اپریل کو ڈاکٹر فیروز احمد کا پہلا خطبہ ’’شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت‘‘ کے عنوان سے تھا۔ بڑی اچھی گفتگو کی۔ایک ساتھی کے Interruption کا انہوں نے بُرا منایا۔تھوڑی بدمزگی پیدا ہوگئی مگر ڈاکٹر صغیر افراہیم کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ چائے کے وقفہ کے بعد ’’شمالی ہند میں اردو غزل میؔر تا غالبؔ‘‘ کے عنوان سے ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنا دوسرا خطبہ پیش کیا جو تحقیقی بھی تھا اور تنقیدی بھی۔تقریر توجہ سے سنی گئی۔ آج جمعہ کا دن تھا، اس لئے لیکچرز کے سلسلے کے بعد جمعہ کی تیاری۔ اکتالیس بیالیس ڈگری درجہ حرارت، تیز گرم ہوائیں، پھر بھی یونیورسٹی کی جامع مسجد کا ہی انتخاب کیا گیا۔ جمعہ کے بعد وہیں دن کا کھانا کھایا گیا اور بغیر سائبان والی رکشا پر بیٹھ کر دھوپ کو چاندنی خیال کرتے ہوئے قیام گاہ لوٹے۔نمازِ عصر کے بعد غلام دستگیر شیخ کے کمرے میں گپ شپ میں لگے تو ان کے ہریانوی پڑوسی نے شُدھ گھی کی مٹھائیاں لا کر دیں، جنہیں وہ کل ہی اپنے وطن سے لے کر آئے تھے۔مٹھائیوں کے بعد اسلام کے ڈھابے میں چائے پی گئی۔مغرب بعد پھر غلام دستگیر شیخ اور ان کے روم میٹ ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ سے ان کے وطن کے احوال، ان کے اہلِ خاندان اور اقرباء کی باتیں ہوتی رہیں۔ایک حضرت مہاراشٹر کے ہیں، دوسرے میسور کے مگر خندہ روئی، اخلاق اور مروت میں دونوں ایک جیسے۔ دونوں ہی خوش اخلاق اور خوش اطوار غلام دستگیر شیخ کا معاملہ میرے ساتھ یہ ہے کہ سلسلۂ قادریہ سے نسبت کے سبب مجھے بہت چاہتے ہیں۔ ہر ملاقات پر بغل گیر ہوتے ہیں اور مجھے بڑے بھائی کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں۔اللہ ان کی عمریں دراز کرے۔شاد اور آباد رکھے۔آمین!

۲۸؍اپریل کو بھوپال کے مشہور سیفیہ کالج کے استاد نعمان خاں کے دو لیکچر ہونا تھے۔نعمان خاں خوش شکل، خوش قطع، خوش اخلاق اور خوش فکر آدمی ہیں۔اردو کے نامور ادیب، نقاد اور معلم سیّد عبدالقوی دسنوی کے داماد ہیں۔سیّد عبدالقوی دسنوی کا تعلق بہار کے مشہور مردم خیز علاقہ دسنہ سے ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ انگریز گورنر نے دسنہ دیکھنے کی خواہش کی تھی کہ جس کی خاک سے سیّد سلیمان ندوی جیسے بیشتر عالی دماغ پیدا ہوئے تھے۔عبدالقوی دسنوی ہمارے کرم فرما سابق پروفیسر اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی مظفر حنفی کے استاد بھی ہیں، اس لئے نعمان خاں تشریف لائے تو ان سے پرانی اُنسیت کا احساس ہو رہا تھا۔ان کے پہلے لیکچر کا عنوان ’’غالبؔ کے قلمی نسخے اور بھوپال‘‘ تھا جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ایک کامیاب محقق کی حیثیت سے پیش کیا۔دوسرا لیکچر ’’نظیرؔ اکبر آبادی‘‘ کے عنوان سے تھا۔اس عنوان کے تحت انہوں نے نظیر کی عوامی شاعری پر عالمانہ گفتگو کی۔تیسرا لیکچر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ شاعر اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز آئی اے ایس عنبر بہرائچی کا ’’سنسکرت شعریات‘‘ کے موضوع پر تھا۔اس موضوع پر ان کی کتاب بھی آچکی ہے۔اردو، انگریزی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت زبانوں پر ان کی ماہرانہ دسترس نے ہم سبھوں کو متاثر کیا۔آج کی شام بھی قیام گاہ پر ہی گزاری۔ یعقوب یاور، محبوب عالم، انعام الحق، شہزاد انجم، غلام دستگیر شیخ، ڈاکٹر ضیاء اللہ اور اختر شاہ گجراتی سے الگ الگ سیشن میں ملاقاتوں اور باتوں کا سلسلہ رہا۔آج ہی ہم لوگوں نے نسرین بیگم کے ساتھ نفیس بانو، یعقوب یاور اور محبوب عالم کو آگرہ کے لئے رخصت کیا، جنہیں کل ایک سیمینار میں شرکت کرنی ہے۔آگرہ تو کل ہمیں بھی جانا ہے مگر ہم کسی سنجیدہ سیمینار میں شرکت کی غرض سے نہیں بلکہ اکاڈمک اسٹاف کالج کی جانب سے سیر کرائے جانے والے پروگرام کا حصہ ہوں گے۔

آج ۲۹؍اپریل کو اکاڈمک اسٹاف کالج کی جانب سے فتح پور سیکری اور آگرہ کی سیر کا پروگرام ہے۔ ذوالفقار کی اس وارننگ کے پیش نظر کہ بس ٹھیک چھ بجے صبح چھوڑ دی جائے گی، بیشتر افراد نے گذشتہ شب جلد ہی بتیاں بجھا کر بستر میں پناہ لی۔ میری رات مگر بڑی بے کلی میں

گزری۔ بیگم کے ساتھ کئی بار آگرہ، دہلی، اجمیر شریف کا پروگرام عملدرآمد کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکا تھا۔ یہ پروگرام ان کے بغیر پایۂ تکمیل تک پہنچنے جارہا تھا۔ خیالات کے ہجوم نے ساؤنڈ سلیپ سے محروم رکھا۔ صبح کو چار بجے ہم نے سب کو جگا دیا۔ اپریل کی آخری تاریخوں میں بھی چار بجے کا وقت علی گڑھ میں صبح کاذب کا وقت ہوتا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ روزہ دار سحری کے لئے جگے ہوں۔ صبح چھ بجے سے قبل ہی ذوالفقار نے فائنل وِسل بجا دیا۔ شدید گرمی کے خوف سے بہت سارے لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ دو بسوں میں سے ایک بس لوٹا دی گئی۔ ذوالفقار کی مہربانی سے بس کے درمیانی حصّے میں جگہ ملی۔ ٹھیک چھ بجے بِسْمِ اللّٰہ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلّا بِاللّٰہُ کی صداؤں کے درمیان بس روانہ ہوگئی۔ سب لوگ خالص تفریحی موڈ میں تھے۔ ہنستے بولتے گاتے بجاتے ہاتھرس بازار آگیا، جہاں صبح کے ناشتے کے لئے بس روک دی گئی۔ علی گڑھی ناشتے کی یکسانیت سے تنگ افراد اپنے اپنے ذوق کے مطابق لذت کام و دہن کا انتظام کرنے لگے۔ گرم گرم پوریوں کے ساتھ کسی نے بالائی، کسی نے دہی، کسی نے چھولے بٹورے اور کسی نے جلیبیوں کا آرڈر دیا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد بس کھول دی گئی۔ کچھ جگہیں تبدیل ہوگئیں۔ اس راؤنڈ میں مجھے بیگ اختر مرزا، غلام دستگیر شیخ اور اشتیاق اعظمی کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا۔ اشتیاق اعظمی سے اشعار، چھوٹے بھائی سے گیت اور بیگ اختر مرزا سے ناقابلِ فراموش لطائف سنتے ہوئے ہم سکندرا پہنچ گئے۔ مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے مقبرے کی وسعت، شان و شوکت، تزئین اور آرائش دیکھ کر ہم خود کو مغلوں کے ہندوستان میں محسوس کرنے لگے۔ مقبرے کے سامنے والے گلزار میں ہم نے تصویریں اُتروائیں۔ اکبر نے اپنے مقبرے کے لئے جگہ کے انتخاب میں جس خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا تھا، ہم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ کاش اس نے ہوس ملک گیری میں اپنی عاقبت کا بھی خیال رکھا ہوتا۔ بس چل پڑی، پھر وہی ماحول اسی قسم کی باتیں۔ پتہ چلا ہماری اگلی منزل فتح پور سیکری یہاں سے چھبیس کلومیٹر دور ہے۔ باتوں باتوں میں یہ فاصلہ طے ہوگیا۔ ہماری بس چڑھائی چڑھنے لگی اور ہم پہنچ گئے۔ ہم سبھوں نے سر بفلک دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وضو خانہ تلاش کیا۔ باوضو ہوکر ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے عظیم المرتبت بزرگ شیخ سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے پر حاضری سے سرفراز ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں شہنشاہ اکبر نے آگرہ سے پیدل چل کر جن کے آستانے پر حاضری دی تھی اور ان کے وسیلے سے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اولاد نرینہ کی دعا مانگی تھی۔ شہزادہ نورالدین محمد سلیم کی پیدائش پر اظہارِ تشکر کے لئے اس نے اس مقام پر عالی شان قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ ہم لوگوں نے حاضری کے بعد تاریخی بلند دروازے کی رفعت دیکھی۔ جودھا بائی کا محل دیکھا۔ وہاں سے وہ میدان دیکھا، جہاں اکبر نے ہیموں کو شکست دی تھی۔ ٹھنڈا پیا، کلفی کھائی اور آگرہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ گرمی ۴۵ ڈگری کے اوپر تھی۔ جب تک فتح پور سیکری میں رہے، احساس کم تھا۔ راستے میں گرمی کی شدت نے ہم سبھوں کو پریشان کر دیا۔ پانی کا اسٹاک بھی ختم ہوگیا۔ راستے میں ایک جگہ ٹیوب ویل پر نظر پڑی تو بس رکوا دی گئی۔ راستے میں لگے اس ٹیوب ویل کا پانی حیرت انگیز طور پر ٹھنڈا بھی تھا اور میٹھا بھی۔ کچھ غیر مسلم دیہاتی لڑکیاں پانی لینے آئی تھیں۔ شہری لوگوں کو دیکھ کر الگ کھڑی ہوگئیں۔ ان کی زیرلب مسکراہٹیں ہماری بے چینیوں کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بس آگرہ شہر میں داخل ہوئی تو نظیر، میر اور غالب تینوں یاد آگئے۔ مگر یہ آگرہ ان کا آگرہ نہیں ہے۔ یہ تو جدید ہندوستان کا ایک جدید شہر ہے، جس میں بہت چوڑی سڑکیں، سر بفلک عمارتیں، فائیو اسٹار ہوٹلز اور بڑے بڑے دفاتر ہیں۔ شہر کے اصل باشندے بھی کہاں ہیں۔ شاید وہ اونچی عمارتوں کے پیچھے چھپے ہوئے محلّوں میں رہتے ہوں گے۔ یہ تو ایک کاسموپولیٹن شہر بن چکا ہے، جہاں ہندوستان کے ہر حصّے کے لوگ اپنی اپنی زبانوں کے اثرات اور لہجوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں اور حصول معاش میں لگے ہوئے ہیں۔ قلعہ سے قریب پارکنگ کے لئے بنائی گئی جگہ پر ہماری بس رُکی۔ قلعہ کے سامنے والے ریستوراں میں ہم سبھوں نے اپنے ذوق کے مطابق

کھانا کھایا۔قلعہ کےٹھیک سامنے اوراس ریستوراں کے بازو میں شیواجی کا ایک بڑا سا مجسمہ نصب تھا۔مغلوں کی اُتھاریٹی کوچیلنج کرتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ پر ننگی تلوار چمکاتا ہوا شیواجی کا مجسمہ آزاد ہندوستان میں فرقہ پرست ذہنیت کا کھلم کھلا اظہار ہے۔ہم لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ سنگھیوں کا ایک بڑا جلوس نعرے لگاتا ہوا پہنچا۔سیڑھیاں لگائی گئیں۔شیواجی کے چرنوں میں پھول چڑھائے گئے۔جلوس میں شامل بیشتر افراد کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور چند کے ہاتھوں میں ترشول دیکھ کرتھوڑی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ خدانخواستہ ان کی رگِ شیطنت پھڑک گئی تو ہم مبتلائے مصیبت ہوسکتے ہیں۔مگر :

؎ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کھانے کے بعد ڈاکٹر اشتیاق اعظمی اور میں نے آٹو کی سواری لی اور پرانے شہر کی ریلوے لائن سے لگی ہوئی جامع مسجد میں نمازِ ظہر کی ادائیگی کے لئے چلے گئے۔یہ مسجد جہاں آرا بیگم نے پانچ لاکھ (آج کی کرنسی میں تقریباً پانچ کروڑ) کی لاگت سے۱۶۴۴ءتا۱۶۴۸ء کی مدت میں بنوائی تھی۔مغل طرزِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ اور جہاں آرا کی مذہبیت کی آئینہ دار یہ مسجد محکمۂ سیاحت اور محکمہ آثارِ قدیمہ دونوں کی عدم توجہی کا شکار ہے۔وہاں سے واپس قلعہ پہنچے تو ہمارے قافلے کے افراد قلعہ کوتقریباً دیکھ چکے تھے۔ہم نے جلدی جلدی میں اپنی آنکھوں کی پیاس بجھائی۔قلعہ کے اندر مرمت کا کام ہونے کی وجہ سے موتی مسجد والا حصہ سیاحوں کے لئے بند رکھا گیا تھا،پھربھی ہم نے اس قلعہ کی شان اورعظمت دیکھی جس نے مغل حکومت کا دورِ شباب دیکھا تھا۔قلعہ کے اندر کئی یادگار تصویریں لی گئیں۔وہاں سے نکل کر ہم لوگ اس جگہ پہنچے، جہاں سے تاج محل کے لئے یکہ گاڑیاں یا دوسری چھوٹی سواریاں ملتی ہیں۔وہاں پہنچتے پہنچتے مطلع ابرآلود ہوگیا اورفرحت بخش تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ان ہواؤں نے فوراً ہی دن بھر کی جھلساتی گرمی کا احساس کافور کردیا۔یکہ پر بیٹھے تو موسم کی رنگینی اور تاج کوقریب سے دیکھنے کے احساس نے ہمیں تازہ دم کردیا۔تاج محل سے قریب پہنچ گئے۔سواریاں رک گئیں مگر تاج ندارد۔تاج محل کہاں ہے بھائی؟ جواب ملا: اتنی جلدی بھی کیا ہے صاحب! ابھی آگے جاؤ، دیکھ لینا تاج محل کہاں ہے اورکیسا ہے۔ٹھیک ہے بھائی۔ہم لوگوں نے ایک وسیع وعریض سرسبز لان عبور کیا۔ٹکٹ کے لئے قطار میں لگے۔اندر گئے۔ایک راہداری کی پیمائش کی ایک سر بفلک آہنی دروازے کے اندر داخل ہوئے۔اندر داخل ہوتے ہی تاج ایک جھماکے کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔سبحان اللہ :

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک تاج کی ہزار ہا تصویریں دیکھی ہوں گی۔دلیپ صاحب کی ایک فلم بھی دیکھی تھی جس کے کچھ مناظر کی شوٹنگ تاج کے اندر بھی ہوئی تھی۔شکیل بدایونی مرحوم کا ایک یادگار گیت بھی فلمایا گیا تھا :

ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل

ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

رفیع صاحب مرحوم اور لتا جی کی آواز نے جس گیت کوتاج کی طرح اَمر کردیا تھا مگر تاج ان ہزار ہا تصویروں اورفلم کے مناظر سے بالکل الگ ایک انفرادی شان کے ساتھ ہمارے سامنے موجود تھا۔آہنی دروازے پر کھڑے کھڑے ہم تاج کے حسن کو اپنی آنکھوں کی راہ اپنے دل میں اُتار رہے تھے مگر پیچھے سے آنے والی بھیڑ ہماری محویت توڑ کرہمیں آگے بڑھنے پرمجبور کررہی تھی۔فوٹو گرافرز کی ایک بڑی تعداد اپنے

اپنے گاہکوں کو پوز بتانے اور تصویر اُتارنے میں مصروف تھی۔ سامنے والا چبوترہ ہر منٹ پر ایک نئی جوڑی یا ایک نئے گروپ کو اپنے پہلو میں بٹھا رہا تھا۔ اس چبوترے کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں سے لی گئی ہر تصویر کے پس منظر میں تاج مکمل طور پر نمایاں تھا۔ چبوترے سے آگے سیڑھیاں اُتر کر اس وسیع و عریض نشیبی میدان میں پہنچ گئے، جہاں بیچ میں نہر تھی اور نہر کی دونوں جانب پتھر کی بنی راہداری تھی۔ ان راہداریوں سے متصل وہ سبزہ زار تھے، جن پر ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے سیلانی اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوزی کا سامان مہیا کر رہے تھے۔ نئے جوڑوں کی ازخودرفتگی کا عالم قابلِ دید تھا۔ ایک انتہائی حسین نوجوان لڑکی نے فوارے چھونے کی کوشش میں اپنے کپڑے بھگو لئے تھے۔ بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جوان جسم سے چپک کر اسے ایلورا کی مورتی بنا رہے تھے اور اس کا ساتھی نوجوان اس بھیڑ سے بے نیاز ہو کر اس مورتی کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے اندر اس منظر کی تاب لانے کی جرأت نہیں تھی۔ لہٰذا ہم آگے بڑھ گئے مگر بہت سارے کیمرے اس منظر کو قید کرنے میں مصروف تھے۔ ہم آگے بڑھے۔ ایسے بہت سارے مناظر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے تاج کی نرم خوابیدہ مرمریں سیڑھیاں چڑھیں اور تاج کی آغوش میں پہنچ گئے۔ حواسِ خمسہ میں سے صرف باصرہ اور لامسہ برسرِ کار تھے۔ بقیہ حواس جیسے سو گئے تھے۔ عقل تھوڑی ٹھکانے لگی تو عاشق و معشوق کی قبروں پر فاتحہ پڑھا اور جمنا کے کنارے والے حصے سے قلعہ کی ایک جھلک دیکھ کر ان ترسی ہوئی آنکھوں کا خیال دل میں لاتے رہے، جنھوں نے ۲۲/سال تک آگرہ کے قلعے سے اپنے محبوب کی آخری آرام گاہ کو تک تک کر اس میں وہ نور بھر دیا تھا جس کی تابانی آج بھی باقی ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ دیارِ محبوب کی مجبور نگاہوں کا نور اگر تاج کو حاصل نہیں ہوا تھا تو اس میں ازخودرفتگی اور دل گرفتگی کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہوتی جو کیفیت تاج کے سوا دنیا کے عجائبات میں سے کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ ہم لوگ سرشار تھے، ازخودرفتہ تھے، دل گرفتہ تھے اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ہماری حالتوں کی ترجمانی بھائی عبدالوحید سلطانپوری، ثم بلیاوی کے اس جملے سے ہوسکتی ہے کہ جب ہمارے میرِ کارواں نے ہمیں اذنِ سفر دیا تو انھوں نے تاج کی سیڑھیوں والے حصّے کی طرف ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں کہا کہ: ''مجھے بس یہیں رہنے دو۔ چاہے کچھ بھی ہو میں تو نہیں جاؤں گا۔'' ساڑھے چھ بجے ہم لوگوں نے بھائی عبدالوحید کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اُٹھایا اور انہیں اپنے ساتھ لئے تاج کو الوداع کہا:

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

راستے بھر مکمل خاموشی رہی۔ کوئی اپنی سوچوں میں کسی کو مخل ہونے کی اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نو بجے ہماری بس ہمیں قیام گاہ پر چھوڑ گئی۔ کھانا کھا کر سب فوراً ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس سفر میں ڈاکٹر انعام الحق کی عدم شمولیت کھلتی رہی۔ کل رات سے ہی ان کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ انہوں نے صبح جب ہمیں ؎ بہ سلامت روی و باز آئی
کہا تو ان کی آنکھوں میں ہمارا ساتھ نہ دے سکنے کی بے بسی نمایاں تھی۔

۳۰/اپریل کی صبح پر کل کی مٹرگشتی کا خمار باقی تھا، پھر بھی معمولات سے پیچھا چھڑانے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد لیکچر ہال میں پہنچے۔ پہلا لیکچر عنبر بہرائچی کا ''ہندوستانی لفظیات'' کے عنوان کے تحت تھا۔ امن و قانون کی نگرانی اور انتظامیہ کے دیگر اُمور کا جوکھم بھرا کام اور پھر ادب لکھنے پڑھنے کا ان کا معاملہ قابلِ تحسین ہے۔ لیکچر معلوماتی اور پُراثر تھا۔ چائے کے وقفے کے بعد کے دونوں لیکچرز سیّد محمد اشرف کے تھے۔ سیّد محمد اشرف مارہرہ شریف کے اس خانوادۂ ارشاد کے چشم و چراغ ہیں، جس سے ہمارا روحانی رشتہ چو تھے

سلسلے میں قائم ہوتا ہے۔ میرے مرشد مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ کو حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں علیہ الرحمہ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔انہیں اپنے والد گرامی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ سے اور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کو فیوض و برکات کا خزانہ سیّد آلِ رسول مارہروی علیہ الرحمہ سے حاصل ہوا تھا۔سیّد محمد اشرف بمبئی میں ڈپٹی کمشنر آف انکم ٹیکس کے اونچے عہدے پر فائز ہیں۔عہدِ حاضر کے اردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ان کے بڑے بھائی سیّد محمد امین خانقاہ برکاتیہ کے مخدوم اور شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ میں سے ایک ہیں۔ان کے چھوٹے بھائی سیّد محمد افضل آئی پی ایس ہیں اور فی الوقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدے کو زینت بخشتے ہیں۔ ؎ ایں ہمہ خانہ آفتاب است

سیّد محمد اشرف لیکچر دینے آئے تو ان کی تقریر کا لطف اُٹھانے کی خاطر ہمارے ہال کی پچھلی نشستوں پر عنبر بہرائچی اور علی احمد فاطمی بھی موجود تھے۔اشرف صاحب آئے۔حسب معمول ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ان کا تعارف کرایا۔اشرف دراز قد، وجیہہ اور خوبصورت آدمی ہیں۔ لیکچر کا عنوان تھا ''اردو میں نعت گوئی کی روایت''تمہیدی جملوں کے بعد اصل گفتگو شروع کرنے سے قبل انہوں نے اس بات کی خواہش کی کہ موجود لوگوں میں سے کوئی انہیں نعت کا ایک شعر سنادے۔میں کھڑا ہوا کہا لیجیے دو شعر حاضر ہیں :

خرامِ ناز کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا
تو محوِ گلبن و گلزار رہ گیا آسیؔ
تری نظر میں جمالِ خیالِ یار نہ تھا

سیّد محمد اشرف نے مجھے غور سے دیکھا جن میں حیرت بھی تھی اور تحسین بھی۔ان کی گفتگو کے لئے میں نے فضا ہموار کردی اور انھوں نے موضوع کا حق ادا کرتے ہوئے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی اپنی مضبوط پکڑ کا ثبوت فراہم کیا۔چائے کے دوسرے وقفے کے بعد ''بیسویں صدی کا عظیم نعت گو احمد رضا'' کے عنوان سے ان کا دوسرا لیکچر بھی بیان اور پیشکش کے اعتبار سے یادگار تھا۔ان کی شوخیِ گفتار نے لیکچر کی دلپذیری میں اضافہ کردیا تھا۔

آج سیّد محمد اشرف کی تقریروں کے درمیان والے وقفے میں ڈاکٹر خالد سیف اللہ سے ابن سینا اکاڈمی کا پروگرام بن چکا تھا۔اس لئے لیکچرز کے بعد کھانا وانا کھا کر ہم نے عصر سے پہلے آرام کو ترجیح دی اور مغرب کے فوراً بعد بھائی خالد سیف اللہ کی رہنمائی میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل پڑے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عظیم الشان ''بابِ سیّد'' سے کوئی پچاس گز پہلے یونیورسٹی روڈ سے داہنی جانب والی سڑک پر ہماری سواری مُڑ گئی۔ یہ سڑک دودھ پور (بروزن جودھ پور) کو جاتی ہے۔اسی سڑک پر کچھ دور جانے کے بعد برولا مارکیٹ کا کمپلیکس آ گیا۔اس خوبصورت اور جدید طرز کے مارکیٹ کے سامنے سڑک کے اس پار ایک کشادہ گلی میں ہماری سواری داخل ہوئی۔اس کشادہ گلی کے آخری سرے پر داہنی جانب جس خوبصورت دومنزلہ عمارت کے سامنے ہماری سواری رُکی، اس کا نام 'تجارا ہاؤس' تھا۔تجارا ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھ کر جب ہم اوپر پہنچے تو بادامی رنگ کی شیروانی میں ملبوس باوقار چہرے اور متبسم آنکھوں والے پروفیسر ڈاکٹر سیّد ظل الرحمٰن نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنا سارا سرمایۂ حیات ابن سینا اکاڈمی کی تعمیر میں لگا دیا تھا اور پھر بھی ایسا شاداں وفرحاں تھا، جیسے اس نے کوئی بڑی بازی جیت لی ہے۔ایک ایسا شخص جس نے ساری عمر معلّمی کی، جس نے تحصیل علم اور ترسیل علم کے علاوہ اور کچھ جاننے کی

کوشش ہی نہیں کی، اس نے پندرہ لاکھ روپۓ کے صرفے سے اپنے خوابوں کو ابن سینا اکاڈمی کی شکل میں مجسم کیا۔ خوبصورت الماریاں بنوائیں اور اپنے مطالعہ کا سارا ذخیرۂ کتب ان خوبصورت الماریوں کی نذر کر دیا۔ خوبصورت میزیں بنوائیں، آرام دہ کرسیاں لگوائیں، ہزاروں کی تعداد میں ڈاک ٹکٹ اور مغل عہد سے لے کر آج تک کے سکوں کا ذخیرہ اس کے حوالے کیا۔ اپنے اس نادر کتب خانے اور میوزیم کو قوم کے حوالے کر چکنے اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعہ پوری دنیا سے جوڑنے کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہے اور

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

کی عملی تفسیر بنا ہوا ہے۔ ہمیں خدا بخش لائبریری اور خدا بخش خاں یاد آ گئے مگر خدا بخش خاں کے مقابلے میں سیّد ظل الرحمٰن کے محدود وسائل پر غور کرنے پر ان کا قد ہماری نظروں میں اور اونچا ہو گیا۔ ہم نے ذخیرۂ کتب اور نوادرات کی زیارت سے اپنے قلب ونظر کی شادابی کا سامان کیا، پُر تکلف چائے پی۔ ان سے ایک انٹرویو کے لئے وقت نکالنے کا وعدہ لیا اور شادمانی کے نہ بھلائے جانے والے احساسات کے بہاؤ میں بہتے ہوئے قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

یکم مئی ہمارے مغربی بنگال میں عام چھٹی کی تاریخ ہوتی ہے۔ مزدوروں کا عالمی دن مغربی بنگال میں اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ شاہراہیں سرخ جھنڈیوں سے رنگین ہو جاتی ہیں۔ صبح سے مزدور یونینوں کے جلوس نکلتے ہیں، جلسے ہوتے ہیں۔ عام چھٹی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے معاشرتی فلاحی ادارے بھی اپنے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ یہاں علی گڑھ میں ایسا کچھ نہیں تھا تو بنگال یاد آ رہا تھا۔ بنگالی یاد آ رہے تھے جو زبان اور تہذیب کے معاملے میں ہندوستان کے دوسرے تمام باشندوں سے زیادہ Conscious ہیں۔ اردو والے تو اپنی زبان کو حقیر سمجھتے ہیں، بنگالی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو دنیا کی تمام زبانوں اور تہذیبوں پر فخریہ ترجیح دیتے ہیں۔ باخبر رہتے ہیں، بیدار رہتے ہیں۔ ہر بنگالی کے گھر تین چار بنگلہ روزنامے آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بنگلہ کا ایک اخبار ''آنند بازار پتریکا'' ہندوستان بھر میں چھپنے والے اردو روزناموں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تعداد میں چھپتا ہے۔ کم وبیش یہی صورت حال دوسرے بنگلہ روزناموں کی بھی ہے۔ بنگالیوں نے دیوار لکھنے اور نعرے لگانے کو بھی آرٹ بنا دیا ہے۔ بنگالی تھیٹر، مراٹھی تھیٹر کی طرح مقبول ہے۔ بنگالی لکھنؤ میں رہے یا دہلی میں، اپنی دکان کا سائن بورڈ بنگلہ میں لکھواتا ہے اور جس خطے میں آباد ہو، گھر کی زبان بنگلہ کو دوسری زبانوں کی آلودگی سے بچائے رکھتا ہے۔

بہر حال علی گڑھ میں یومِ مئی چھٹی کا دن تو تھا نہیں، اس لئے ہم نے تیاری کی اور لیکچر ہال کی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ آج کے پہلے Resource Person انجمن ترقی پسند مصنفین کے کل ہند جنرل سکریٹری، الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے استاد، مشہور ادیب اور ناقد ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا تعارف ڈاکٹر صغیر افراہیم نے کرایا۔ ان کا پہلا لیکچر ''ترقی پسند اردو غزل'' کے عنوان سے ہوا۔ ظاہر ہے موضوع ان کا اپنا تھا، اس لئے جم کر بولے۔ چائے کے وقفے میں ان سے مزیدار باتیں ہوئیں۔ دوسرا لیکچر مجروح سلطانپوری سے معنون تھا۔ مجروؔح صاحب پر گفتگو شروع ہونے سے قبل میں نے ان کا یہ شعر سنا کر فاطمی صاحب اور اپنے رفقاء کا ذہن بنا دیا :

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ　　　دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار

چائے کے وقفے میں دہلی کے اردو اساتذہ میں بزرگ تر اشفاق محمد خاں صاحب سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ تیسرا لیکچر انہیں کا تھا۔ عنوان تھا: ''ترقی پسند اردو نظم''۔ خاں صاحب کی گفتگو میں عالمانہ شان کے علاوہ بذلہ سنجی اور ظرافت کی آمیزش نے چار چاند لگا دیئے تھے۔

آج کی شام باہر نکلنے کا کوئی چانس نہیں تھا، اس لئے کہ ڈاکٹر صغیر افراہیم نے علی احمد فاطمی کے اعزاز میں اسٹاف کالج کا من روم میں ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ علی احمد فاطمی نے ''نئی تنقید کی رفتار'' کے عنوان سے پُرمغز مقالہ پیش کیا۔ مقالہ پیشکش اور مواد دونوں اعتبار سے قابلِ قدر تھا۔ مقالہ خوانی کے بعد مظہر مہدی، یعقوب یاور، شہزاد انجم اور معین الدین جینابڑے کے اُٹھائے گئے سوالات نے اعلیٰ پائے کی علمی بحث کی راہ ہموار کی۔ شرکائے نشست نے بحث کا خوب خوب لطف اُٹھایا۔

۲ر مئی کو ریفریشر کورس میں شامل افراد کو صبح نو بجے گروپ فوٹو کے لئے یکجا ہونا تھا۔ صبح سے لوگ سجنے اور سنورنے میں لگے رہے۔ نو بجے میاں ذوالفقار نے خبر دی کہ ڈائریکٹر صاحبہ تشریف لا چکی ہیں۔ کیمرہ مین بھی آ گیا ہے، اس لئے ہم لوگ اسٹاف کالج کے سامنے والے حصے میں گھنے درختوں والے سبزہ زار پر پہنچ جائیں۔ تھوڑی دیر میں سبھی پہنچ گئے۔ شرکاء کے علاوہ اس گروپ فوٹو کو یادگار بنانے والوں میں ڈائریکٹر پروفیسر حمیدہ احمد، ڈپٹی ڈائریکٹر زاہد حسین، کورس کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر صغیر افراہیم اور ان کی اہلیہ محترمہ اور ہماری پیاری بہن ڈاکٹر سیما صغیر اور ڈاکٹر اشفاق محمد خاں (جو پہلے لیکچر کے لئے تشریف لا چکے تھے) شامل تھے۔

فوٹو گرافی کے بعد علی سردار جعفری پر ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کا لیکچر شروع ہوا۔ گروپ فوٹو کے زیرِ اثر سبھی تفریحی موڈ میں تھے۔ اشفاق صاحب نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اپنی گفتگو مختصر کر دی اور اپنی تدریسی زندگی کے تجربات سنا کر ہمیں محظوظ کیا۔ چائے کے وقفے کے بعد مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی کا اردو مرثیہ نگاری پر یادگار لیکچر ہوا۔ مرثیہ کے آغاز و ارتقاء سے لے کر عہد جدید کی اردو مرثیہ نگاری پر ڈاکٹر صاحب کا خطبہ برسوں یاد رکھے جانے کے لائق تھا۔ چائے کے دوسرے وقفے کے بعد ''اردو مرثیہ نگاری کے دو عظیم نام — انیسؔ اور دبیرؔ'' کے عنوان سے دوسرا خطبہ بھی یادگار رہا۔ مراثیِ انیس و دبیر سے درجنوں بند سنا کر ڈاکٹر صاحب نے اپنی زبردست قوت حافظہ کی بھی داد حاصل کی۔ ان کی خطابت ایک نرم سیر دریا تھی جس کے بہاؤ میں ہم سارے بہے جا رہے تھے۔

آج کی شام ہمیں مولانا آزاد لائبریری کے کلچرل ہال میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے کہ آج سیّد محمد اشرف کے افسانوی مجموعے ''بادِ صبا کا انتظار'' کی رونمائی ہونے والی تھی۔ عصر کی نماز پڑھ کر ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ پہنچے تو تقریب بس شروع ہونے ہی والی تھی۔ ڈاکٹر سراج اجملی نے نقابت کے لئے مائیکروفون ہاتھ میں لیا اور تمہیدی کلمات میں ہی لوگوں کے دل جیت لئے۔ سیّد محمد اشرف کے فن پر منظور ہاشمی، صغیر افراہیم، شافع قدوائی، عقیل احمد، خورشید احمد، ابوالکلام قاسمی، شہریار، سیّد محمد امین، علی احمد فاطمی اور نورالحسن نقوی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مغرب کی نماز کے لئے وقفہ ہوا۔ نمازِ باجماعت کی امامت خود سیّد محمد اشرف نے فرمائی۔ پُرتکلف ناشتہ ہوا اور تقریب پھر سے شروع ہوئی۔ تقریباً چالیس منٹ کے وقفے نے بھی سامعین کو بٹھائے رکھا، یہ اس تقریب کی خاص بات تھی۔ اس تقریب میں طلبہ یونین کی نمائندگی ایک ریسرچ اسکالر نے کی اور مہمانِ خاص شعبۂ ہندی کے سبکدوش صدرِ شعبہ پروفیسر ایس پی سنگھ تھے۔ یونین والے بچے کا نام ذہن میں محفوظ نہیں رہنے کا افسوس ہے۔ رات دس بجے تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ بہاری ہوٹل نے ہمارے کھانے کا نظم کر رکھا تھا، ورنہ ہماری پریشانی بڑھ جاتی۔

۳ر مئی کو پہلا لیکچر کانپور کے حلیم کالج کی ڈاکٹر مہہ لقا اعجاز کا تھا۔ ''اردو شاعری میں شہر آشوب کی روایت'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحبہ نے اچھی گفتگو کی مگر ان کے اپنے شہر کانپور کے کشیدہ حالات، جن میں وہ اپنے اہلِ خانہ کو چھوڑ آئی تھیں، کا اثر ان کی گفتگو پر حاوی تھا۔ چائے کے وقفہ کے بعد ''اردو شاعری کی تنقید'' پر گفتگو کے لئے پروفیسر قاضی افضال حسین تشریف لائے۔ قاضی افضال حسین مردانہ وجاہت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کی گفتگو، ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔ قاضی جمال حسین آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شعبے کے طلبہ

اور اساتذہ میں قاضی صاحب بہت مقبول ہیں۔انہیں سننے کے لئے شعبے کی کچھ سینئر طالبات بھی موجود تھیں۔قاضی صاحب بولنے پر آئے تو ان کی علمیت کا سیلاب ہمیں خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے جارہا تھا۔چائے کے وقفے میں ڈاکٹر صغیر افراہیم نے میرا تعارف قاضی صاحب سے کرایا۔میں نے کہا کہ میں بہت سوالات کرنے کے لئے بدنام ہوں۔قاضی صاحب نے مسکرا کر کہا ہاں میں نے بھی سنا ہے۔یہ تو اچھی بات ہے۔میں نے کہا حضرت آپ کی گفتگو کے درمیان میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔پوچھا کیوں؟ میں نے بتایا کہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً آپ نے میری بولتی بند کردی تھی۔قاضی صاحب ہنسنے لگے کہا ارے ایسا بھی کیا ہے۔تیسرا لیکچر ڈاکٹر شافع قدوائی کا تھا۔شافع صاحب شعبہ صحافت میں ریڈر ہیں اور اردو کے چند اہم ناقدوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔میرا جی پر ان کی گفتگو عالمانہ شان کی مظہر تھی۔لیکچرز کے بعد کھانا کھایا، آرام کیا بعد نمازِ مغرب پانچ دنوں کے طویل وقفہ کے بعد آج آفتاب کا رُخ کیا۔ڈھیر ساری شکایتوں کا سامنا کرنا پڑا۔معذرت چاہی، پھر بہت سارے موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ رہا۔پرینکا میں اکٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور اکاڈمک اسٹاف کالج کی راہ لی۔

۴؍مئی جمعہ کا دن۔نہادھوکر کچھ وظائف، کچھ نفل نمازیں، پھر ناشتہ اور اسٹاف کالج کا لیکچر ہال۔جمعہ کو صرف دو لیکچرز ہوتے ہیں۔پہلا لیکچر شعبہ اردو کی باوقار شخصیت پروفیسر قیصر جہاں کا تھا۔اردو گیت پر قیصر آپا کا لیکچر بڑا بھرپور تھا۔ہندوستانی ادبیات میں گیت کی روایت سے لے کر اردو میں صنفِ گیت کے آغاز وارتقاء اور اس کی مجموعی صورتِ حال پر انہوں نے بسیط گفتگو کی۔دوسرا لیکچر پروفیسر مہ لقا اعجاز کا تھا۔آج کا موضوع تھا:''اردو پیروڈی'' موصوفہ نے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی بجائے پیپر پڑھا۔تیس منٹ میں پیپر پڑھے جانے کے بعد فرقہ واریت کے اثرات پر ایک مذاکرہ ہوا۔ڈاکٹر صغیر افراہیم نے اپنے خیالات رکھنے کے بعد موضوع کی مناسبت سے گفتگو کی دعوت دی۔ڈاکٹر امتیاز احمد، مظہر مہدی، معین الدین جینا بڑے اور خاکسار نے اپنے اپنے خیالات رکھے۔وقت کی تنگی نے اور لوگوں کو مذاکرے میں شرکت سے معذور رکھا۔آج جمعہ کی نماز انہونا ہاؤس والی مسجد میں پڑھی۔یہ مسجد اکاڈمک اسٹاف کی سیدھ والی سڑک پر تصویر محل تک جانے کے بعد اسٹیشن کی طرف مڑنے والی سڑک پر چند قدم چلنے کے بعد داہنی طرف کی کشادہ گلی میں واقع ہے۔مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔نماز کی ادائیگی کے بعد باہر نکلتے وقت ایک صاحب کو پریشان دیکھا، پتہ چلا ان کی چپل نہیں مل رہی ہے۔ہنسی آگئی۔یا خدا مسجد چاہے علی گڑھ کی ہو یا کلکتے کی، یہ مصرع تو یاد رکھنا ہی پڑتا ہے ؎ اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار۔کھانا وانا کھا کر کمرے میں آرام کے لئے آئے تو معین الدین جینا بڑے چلے آئے۔دبیر احمد کے خالی بستر پر دراز ہوکر باتیں کرنے لگے اور تھوڑی دیر میں گہری نیند میں سو گئے۔یہ معین الدین جینا بڑے بمبئی یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ہندوستان گیر شہرت کے حامل افسانہ نگار ہیں۔اردو کے علاوہ انگریزی پر دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔زندگی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں مگر ان کے چہرے کی معصومیت پہلی نظر میں لوگوں کو دھوکا دے دیتی ہے۔میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ان کے معصوم چہرے کو تکنے لگا جو نیند کی حالت میں اور بھی معصوم ہوگیا تھا۔میں انہیں دیکھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ اس بھلے مانس کو سلامت رکھے۔اس کے چہرے کی معصومیت (جو اس کے کومل دل ہونے کا ثبوت ہے) قائم رکھے اور اس کے قلم کو مزید توانائیاں عطا کرے۔معین کی بھولے پن کی بعض ادائیں یادگار ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک دن جب ہم سب جماعت کی تیاری کر رہے تھے، معین الدین نے بھی ٹوپی لگائی اور نماز کے لئے چلے آئے۔انھیں آتا دیکھ کر اختر بیگ مرزا کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔تحریر بیگ اور عبدالوحید نے بھی مسکرا کر خیریت پوچھ لی، پھر کیا تھا معین الدین مسکین صورت بنائے میرے پاس آئے اور انتہائی بھولے پن سے ان لوگوں پر مقدمہ دائر کردیا اور جب تک ان حضرات سے باز پرس نہیں کرلی گئی، یہ روٹھے ہی رہے۔

۵ر مئی کو پہلا لیکچر سیّد محمد ہاشم کا تھا۔ گذشتہ صفحات میں ان کا تعارف ہو چکا ہے۔ آج ''قصیدے کا فن'' اس عنوان پر انہیں بولنا تھا اور توقع کے مطابق جم کر بولنا تھا مگر چند گھریلو الجھنوں کی وجہ سے وہ انتشارِ ذہنی کا شکار تھے۔ ہم لوگوں نے ان کی کیفیت کا اندازہ کر کے ان سے تعاون کیا اور ان کا موڈ خوشگوار بنانے کی کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ چائے کے وقفہ کے بعد غضنفر علی کا لیکچر تھا۔ ''نظم کی تدریس'' کے موضوع پر انہوں نے کامیاب خطبہ دیا۔ چونکہ ان کا تعلق حکومت اتر پردیش کے محکمۂ تدریسی تحقیق سے ہے، اس لئے گفتگو خالص تکنیکی رہی، پھر بھی ان کی ہنرمندی نے گفتگو کو خشک ہونے سے بچالیا۔ چائے کے دوسرے وقفے میں لیکچر ہال سے متصل کامن روم میں غضنفر ہم لوگوں کے ساتھ چائے پینے بیٹھے۔ اتفاق سے موجود تمام لوگوں کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا۔ بات بہاریوں کی نکلی تو یہ بات بھی سامنے آئی کہ بہاری اپنی گفتگو میں اپنے بہاری ہونے کی کوئی نہ کوئی پہچان ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ غضنفر نے اپنی بیٹی (جو میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں) کے حوالے سے یہ بات بتائی کہ میڈیکل کالج کے ایک پروفیسر کے بارے میں جاننا مشکل تھا کہ ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ مگر ایک دن جب وہ کسی بات پر بہت خوش تھے تو انہوں نے ایک طالب علم کو جس لقب سے نوازا، وہ ان کے خالص بہاری ہونے کا ثبوت فراہم کر گیا، اس لئے کہ صرف اور صرف بہاری ہی اس لفظ کا استعمال کر سکتا ہے، دوسرے کی زبان پر وہ لفظ آ ہی نہیں سکتا ہے۔ ایسی ہی پُر لطف باتوں میں چائے کا وقفہ تمام ہوا۔ غضنفر نے اپنا دوسرا خطبہ ''مثنوی کی تدریس'' کے عنوان سے دیا۔ خالص ٹیکنیکل ہونے کے باوجود انہوں نے آخر تک گفتگو کو دلچسپ بنائے رکھا۔ آج نمازِ عصر کے بعد آبجیکٹیو اسٹڈیز کی نشست میں جانا تھا مگر مغرب کی جماعت کے اہتمام نے وہاں جانے سے روک دیا۔ مغرب کی جماعت کے بعد اپنے رفیق کار دبیر احمد کے برادرِ نسبتی (جو دہلی سے آئے ہوئے تھے) کو لے کر تصویر محل گیا، وہاں چائے پی گئی اور ایک دوسرے کی کہی اور سنی گئی۔ دبیر احمد، شاہین اور نسیم النساء کے ساتھ میڈیکل کالونی گئے ہوئے تھے۔ نو بجے اچانک صغیر افراہیم صاحب اپنے ایک دوست (غالباً ان کا نام کمال تھا) کے ساتھ وارد ہوئے۔ کہا یہ کیا بات ہوئی۔ رات کے کھانے پر آپ مدعو ہیں اور یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دعوت سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو کمیونی کیشن گیپ پر تاسّف کا اظہار کیا تو ہم نے کہا کہ کبھی کبھی مائیکرو ویو کی تکنیکی خرابی سے ترسیل کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دونوں ہنس پڑے اور تھوڑی دیر میں ان کی ماروتی میڈیکل کالونی کی طرف رواں ہوگئی۔ وہاں ایک پُر تکلف عشائیہ پر ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ گیارہ بجے شب واپسی ہوئی۔ دہلی سے آئے ہوئے مہمان کے لئے میں نے اپنا بیڈ چھوڑا اور انعام الحق کے کمرے میں چلا گیا، جہاں شہزاد انجم کی غیر حاضری میں ان کا بستر خالی پڑا تھا۔

۶ر مئی اتوار چھٹی کا دن تھا۔ دبیر احمد اپنے برادرِ نسبتی کے ساتھ امیر نشاں کی طرف نکلے ہیں۔ ناشتے کے بعد پہلے معین الدین جینا بڑے اور اشتیاق اعظمی کے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہم تینوں انعام الحق کے کمرے میں آئے، جہاں لطائف کی محفل جمی۔ ہنستے ہنستے پیٹ پر بل پڑ گئے۔ بھوک بھی لگ گئی تو دن کے کھانے کا خیال آ گیا۔ جینا بڑے شمشاد مارکیٹ چلے گئے۔ ان کو وہیں کا کھانا پسند تھا۔ ہم لوگوں نے بہاری ہوٹل کا رُخ کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد یعقوب یاور کے کمرے پر ہلّہ بول دیا گیا۔ مزے کی باتیں ہوئیں۔ یعقوب بھائی نے پھل کھلائے اور محبوب عالم نے چائے پلوائی۔ آج کا پورا دن بھرپور تفریح میں گزرا۔

۷ر مئی کو بدھ پورنیما کی چھٹی تھی۔ آج بھی تفریحی مزاج بنا رہا۔ خوب دھما چوکڑی مچی۔ دوپہر کو اشتیاق اعظمی نے ایک رسالے میں چھپے جگر کے طرحی مصرعے ؎ بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا پر غزل کہنے کا چیلنج دیا۔ میں نے کہا: اشتیاق بھائی کیوں پریشان کرتے ہو مگر انہوں نے بھی ضد باندھ لی یا تو غزل کہو یا پھر کہہ دو کہ تمہیں شاعری نہیں آتی ہے۔ انعام الحق بھی اس سازش میں شریک ہوگئے۔ دونوں سر پر سوار اور غزل

چاہیئے ہی چاہیئے۔اس تفریحی موڈ میں کاغذقلم سنبھالنا اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مگر ۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا۔۶ شعر مع مقطع کہنے پر گلوخلاصی ہوئی۔ دوپہر کے کھانے پر یاد آیا آج ابن سینا اکاڈمی کے سربراہ پروفیسر سیّدظل الرحمٰن صاحب سے مغرب بعد اِنٹرویو کا وقت لے رکھا ہے۔اشتیاق اعظمی کوراضی کیا کہ بھائی میرے آج شام کہیں بھاگیو نہیں۔ میرے ساتھ ابنِ سینا اکاڈمی چلیو۔ وہ راضی ہوگئے۔ مغرب کی نماز کے بعد یونیورسٹی روڈ سے ہم لوگوں نے دودھ پور کیلئے رکشالیا۔تجارا ہاؤس میں داخل ہوئے تو ایک پروقار مسکراہٹ نے ہمارا استقبال کیا۔تھوڑی دیر میں تمہیدی گفتگو، چائے کا دور اور انٹرویو کا سلسلہ۔ یہ انٹرویو کلکتہ اور دہلی سے شائع ہونے والے کثیرالاشاعت روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کی اتوار ۱۵رجولائی ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں اہتمام سے شائع ہوا۔ ہمارے اس انٹرویو کا مقصد اردو داں طبقے کو اس عظیم الشان کارنامے سے روشناس کرانا تھا، جو علی گڑھ کی ایک گلی میں شہرت اور ناموری کی خواہش سے بے نیاز ہو کر ایک قلندرانہ صفت کا حامل شخص انجام دے رہا ہے۔آپ بھی اس انٹرویو کا لطف اُٹھایئے۔

شاہداختر : پروفیسر صاحب! یہ ایک عام کلیہ ہے کہ آدمی کی شخصی تعمیر وتشکیل میں اس کا خاندانی اور معاشرتی پس منظر کارفرما ہوتا ہے۔آپ اپنی ابتدائی زندگی کے حصول تعلیم کے حوالے سے اس پس منظر پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارہ فرمائیں، جنہوں نے آپ کی شخصی تعمیر وتشکیل میں بڑا رول ادا کیا۔

پروفیسر ظل الرحمٰن : میرا تعلق تجارا ریاست الور کی اس شاخ سادات سے ہے جس کے بزرگ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے۔ ہمارا شجرہ نسب امام علی رضا سے ملتا ہے۔ دہلی، رتھمبور، مہاترس میں قیام کے بعد ۱۸۱۵ء کے آس پاس اس خاندان نے تجارے میں بود وباش اختیار کی۔ میرے خاندان کی ایک شاخ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھوپال منتقل ہوگئی تھی۔اس شاخ میں منشی حکیم الدین انتظامیہ کے سب سے بڑے عہدے میر منشی (چیف سکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے بیٹے حافظ مظہر حسین عدلیہ کے سب سے بڑے منصب صدر الصدور (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز تھے۔اسی شاخ میں میرا ننہال تھا۔میری پیدائش وہیں بھوپال میں یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ میرے دادا حکیم سیّد کرم حسین ناطق تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ میرے تایا حکیم سیّد عتیق القادر اور والد حکیم سیّد فضل الرحمٰن بھی صاحب تصنیف اور حاذق طبیب تھے۔ خاندان میں علم وفضل اور طب کی روایت سینکڑوں برس سے قائم ہے۔ گھر کے اس ماحول کا میری نشوونما پر اثر پڑا۔ ندوۃ العلماء کے علمی ماحول نے مزید جلا بخشی پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مختلف علوم وفنون کے ماہر اساتذہ بالخصوص شفاء الملک حکیم عبداللطیف جیسے مایہ ناز استاذانِ طب کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا اور میرے اندر لکھنے پڑھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میری ابتدائی تعلیم تجارا، بھوپال کے اسکول میں ہوئی۔ ندوۃ العلماء سے عالمیت کی سند حاصل کی۔۱۹۶۰ء میں علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کیا۔

شاہداختر : آپ کا تعلق بھوپال کے ایک مشہور علمی خانوادے سے ہے۔آپ نے علی گڑھ کو اپنا وطن ثانی کیوں بنایا؟ کوئی خاص وجہ؟

پروفیسر ظل الرحمٰن : علی گڑھ ۱۹۵۵ء میں طالبعلم کی حیثیت سے آنا ہوا۔ طالبعلمی دور ختم ہوا تو طبیہ کالج میں

تقرری ہوگئی۔عمر کا تقریباً سارا حصہ علی گڑھ میں گزرا۔ بھوپال سے باہر رہتے ہوئے نصف صدی گزرنے کو آئی۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی علی گڑھ ہی رہا اور اب تو ان کا اصل وطن ہی علی گڑھ ہے، اس لئے بھوپال کے بجائے علی گڑھ میں قیام کو ترجیح دی۔ یہاں علمی اور فنی ماحول کے علاوہ دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے اور یہی احباب اب عزیزوں سے بڑھ کر ہیں۔ بھوپال میں ریاست کے زمانے میں جو ماحول تھا اور تمام اعزہ جس طرح ایک خاص محلّے میں آباد تھے، وہ ماحول باقی نہیں رہا۔ تقسیم کے بعد بھوپال، تجارا اور الور کے سارے عزیز پاکستان چلے گئے۔ میرے جد امجد نے ہندوستان میں قیام کو ترجیح دی اور ۱۹۴۷ء میں ہم لوگ تجارے سے بھوپال منتقل ہو گئے لیکن وہاں کے عزیزوں میں بھی بیشتر نے پاکستان کو اپنا وطن بنالیا۔ میں نے سر سیّد کے علی گڑھ کو اپنی نسل کیلئے پسند کیا۔

شاہداختر : کتابیں اور نوادرات جمع کرنے کی خواہش اول اول کب بیدار ہوئی؟ اور پھر یہ خواہش جنون کی حد تک کیسے پہنچ گئی؟

پروفیسر ظل الرحمٰن : تجارے میں ہماری سات حویلیاں تھیں۔ ان حویلیوں کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''حیات کرم حسین'' میں بھی کیا ہے۔ ان میں سے ایک حویلی میں قدیم خاندانی کتب خانہ تھا جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں، نادر خطی نسخے خاص طور پر خاندان کے بزرگوں کی قلمی کتابیں، فرامین اور ان کے فتاویٰ کی نقلیں موجود تھیں۔ یہ ذخیرہ تجارا کے فسادات کی نذر ہو گیا۔ دہلی میں بھی ہمارے مکانات تھے۔ جد محترم کا ۴۷ء میں اتفاق سے دہلی میں قیام تھا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ جب بھی تین چار ماہ قیام کے ارادے سے دہلی جاتے تو کئی بوریوں میں انکی کتابیں ساتھ ہوتی تھیں۔ یہ کتابیں فسادات کی نذر ہونے سے بچ گئیں۔ مجھے ان میں سے بڑے ہونے پر جو کتابیں دستیاب ہوئیں، ان کی تعداد گرچہ پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں تھیں لیکن مجھے ان کی حفاظت کا شوق دامن گیر ہوا۔ پھر میں نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ بغیر ذاتی ذخیرے کے کوئی علمی کام بہت مشکل ہے۔ کسی کتاب کی تلاش میں یونیورسٹی لائبریری جانا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کتاب ایشو ہے، مل نہیں رہی ہے یا غائب ہے، آدمی چھٹی پر ہے، لائبریری بند ہے۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ کام ادھورا رہ جاتا اور بعد میں طبیعت اس سے ہٹ جاتی تھی۔ اسی پریشانی کی وجہ سے آہستہ آہستہ خود کتابیں فراہم کرنے کی کوشش کی اور تقریباً چالیس برس کے عرصے میں ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس ہزار ہو گئی اور ایک بڑی لائبریری کی شکل اختیار کر لی جس میں چار سو مخطوطات بھی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج اس لائبریری میں طب، اسلامیات، تذکرے، سوانح ادب کے علاوہ اقبال، علی گڑھ، بھوپال پر خاص گوشے اور تاریخ طب اور سائنس کے خاص گوشے میں غالبیات پر تقریباً تین سو کتابیں اور میگزین ہیں۔ ڈاک ٹکٹوں کا قصہ یہ ہے کہ حکیم کرم حسین صاحب نے ۱۸۹۴ء میں دواخانہ شفاء الامراض قائم کیا تھا۔ اس دواخانے کی دوائیں ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ ہندوستان سے باہر ملایا، سیلون، برما، جنوبی افریقہ، انڈونیشا اور دوسرے ملکوں میں جاتی تھیں۔ دوا خانے سے ایک رسالہ ''مسیحائے زماں'' ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۰ء تک جاری رہا۔ گورنمنٹ نے اس کے کام کی زیادتی

کو دیکھتے ہوئے دواخانے میں ہی ایک پوسٹ آفس قائم کردیا۔ یہ افتخار کم اداروں کو حاصل ہوتا ہے۔ دواخانے میں باہر کے ملکوں کی ڈاک کثرت سے آتی تھی۔ ان پر ٹکٹ لگے ہوتے تھے چنانچہ سات آٹھ سال کی عمر سے مجھے ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کی تکمیل میں میرے دوستوں نے بھی بڑا تعاون کیا۔ مجھے جن دوستوں سے ڈاک ٹکٹ ملتے رہے ہیں، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن لوگوں نے مجھے ڈاک ٹکٹ عنایت کیئے، ان میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر ابوالعلیٰ حسینی، مولانا عمران خاں ندوی، سیّد حامد، سیّد ہاشم علی، پروفیسر ایم ایم فاروقی حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کا میں خاص طور پر نام لینا چاہوں گا۔ اس کے علاوہ جو بڑے بڑے ذخیرے جنکے توسط سے ملے، ان میں پروفیسر نفیس بیگ، پروفیسر مسعودالرحمٰن خاں ندوی، پروفیسر اطہر حسین صدیقی، پروفیسر ضیاءاللہ انصاری اور سریندر کمار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر شمیم جیراجپوری، وائس چانسلر اردو یونیورسٹی نے دو ہزار ڈاک ٹکٹ عنایت کر کے میرے ذخیرے کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ سکوں اور کرنسی ،نوٹوں کا شوق بعد میں پیدا ہوا۔ فی الحال اس اکاڈمی میں چھبیس ہزار ڈاک ٹکٹ، ڈھائی ہزار سکے، مختلف ممالک کے دو سو کرنسی نوٹ، وصلیاں، پینٹنگز، فرامین، ظروف اور دوسری قدیم اشیاء موجود ہیں۔

شاہد اختر : ابن سینا اکاڈمی کے قیام کے خیال کے محرکات پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

پروفیسر ظل الرحمٰن : جہاں تک اس نام کا تعلق ہے، اس کی وجہ ابن سینا سے میری ذہنی مناسبت ہے۔ اس کے بے پناہ علم و فضل اور اس کی شخصیت سے میرا استفادہ ہے۔ دہلی کے زمانۂ قیام ۱۹۶۵ء میں، میں نے مجلس ابن سینا قائم کی تھی جس میں علمی مذاکرات کا سلسلہ رہتا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں بیتا پارہ اعظم گڑھ طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا تو میری تجویز پر اسے بھی ابن سینا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد بھی میں نے ہی رکھا تھا۔ جب میں نے علی گڑھ میں ایسی اکاڈمی قائم کرنا چاہا جس کا تعلق تاریخ، طب اور سائنس سے ہے تو ظاہر ہے ابن سینا سے بہتر کون ہوسکتا تھا جس کے نام سے اس اکاڈمی کو نسبت دی جاتی۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ابن سینا سے بڑی عبقری شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ نہ صرف طب بلکہ سائنس اور فلاسفی کی بھی بڑی شخصیت ہے۔ فلسفہ، کیمیا اور ادویات پر اس کا کام بڑا قابل قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس کو ارسطو اور فارابی کا ہم پلّہ قرار دیتے ہوئے معلم ثالث کہا گیا ہے۔ اس اکاڈمی کے قیام کا مقصد تاریخ، طب اور سائنس کا مطالعہ ہے۔ بالخصوص مسلمانوں نے آٹھویں صدی تا پندرہویں صدی ان علوم میں جو خدمات انجام دی ہیں، انہیں سامنے لانا ہے۔ اس مقصد کے تحت اکاڈمی کے نیوز لیٹر کے علاوہ ایک ریسرچ جرنل کی اشاعت بھی پیش نظر ہے۔

شاہد اختر : پروفیسر صاحب! آپ نے ابن سینا اکاڈمی بنا کر قوم کی توقعات بڑھا دی ہیں۔ آپ اسکے مجموعی خدوخال اور آئندہ کی کارکردگیوں کا ایک اجمالی خاکہ بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

پروفیسر ظل الرحمٰن : ابن سینا اکاڈمی میں علمی اور تحقیقی کام کے علاوہ ایک لائبریری قائم ہے۔ ایک باضابطہ میوزیم کا قیام جلد عمل میں آنے والا ہے۔ اسکے علاوہ اشاعتی منصوبہ ہے جس کے تحت تاریخ، طب اور سائنس پر

کتابیں شائع کی جائیں گی۔ ان موضوعات پر مسلم یونیورسٹی کے بزرگ اساتذہ کے لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے چنانچہ اس سلسلے کا پہلا لیکچر جغرافیہ کی بین الاقوامی شخصیت پروفیسر محمد شفیع کا ۱۹ رمئی کو ہونے جارہا ہے جس کا موضوع ''جغرافیہ میں مسلمانوں کی خدمات'' ہے۔ یہ لیکچر کئی سیریز پر مشتمل ہوگا اور بعد میں اسے کتابی شکل دی جائے گی۔ اکاڈمی کے قیام کا مقصد نوجوان نسل کی ذہنی اور فکری تربیت بھی ہے۔ مختلف موضوعات پر مواد کی فراہمی مآخذ کی نشاندہی، تصنیف وتالیف اور تحقیق میں ان کی مدد اکاڈمی کے خاص مقاصد ہیں۔ علی گڑھ کے علاوہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر لکھنؤ، حیدرآباد، دہلی، بھوپال یا پٹنہ میں اگر یہ لائبریری قام کی جاتی تو شاید اتنے لوگ اس سے استفادہ نہ کرپاتے۔ علی گڑھ چونکہ علم کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اہل علم، محققین اور اسکالرز بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ فاصلے بھی بڑے شہروں کے مقابلے میں کم ہیں اس لئے یہاں اس اکاڈمی سے فائدہ اُٹھانا بہت آسان ہے اور یہاں اس کا مقصد زیادہ بہتر طور پر پورا ہوسکتا ہے۔ علی گڑھ میں تاقیامت اسکالرشپ موجود رہے گا اور لوگوں کو اس کا فائدہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔ اکاڈمی کی اپنی ویب سائٹ اور انٹرنیٹ سسٹم ہے۔ باہر سے ای۔میل کے ذریعہ علمی سوالات کے جوابات کی دریافت کا سلسلہ علی گڑھ سے باہر کے لوگوں کو بھی گھر بیٹھے اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتا رہے گا۔

شاہد اختر : ابن سینا اکاڈمی کے قیام کی جرأت مستانہ کی مبارک باد! مگر یہ تو بتائیں کہ اس چمنستان علم و حکمت کی آبیاری کی صورتیں کیا ہونگی؟

پروفیسر ظل الرحمٰن : ابن سینا اکاڈمی کی عمارت اور اسکی تعمیر میں تقریباً ۸ لاکھ روپئے کا صرفہ میری جیب خاص سے ہوا۔ اس کام میں کسی شخص کی کسی طرح کی مالی معاونت حاصل نہیں کی گئی۔ میں یونیورسٹی کا ایک معمولی ٹیچر ہوں۔ میرا کوئی کاروبار نہیں۔ زندگی بھر جو کمایا، اس میں لگادیا ہے۔ جو قیمتی ذخیرۂ کتب اور نوادرات تھے، اسے بھی اکاڈمی کی نذر کردیا۔ یہ سلسلہ میرے بعد بھی قائم رہے، اس خیال سے اسے باقاعدہ سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ کراکے وقف کردیا ہے۔ دو ہال کی تعمیر انشاء اللہ اپنے خرچ سے کراؤں گا مگر اصل مسئلہ اس کے روزمرہ کے اخراجات کا ہے۔ کم سے کم ایک لائبریری اَٹینڈنٹ اور ایک پروفیشنل اسسٹنٹ کا تقرر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بجلی، فون، انٹرنیٹ اور میٹنگز وغیرہ کے لئے پانچ، چھ ہزار روپئے ماہانہ درکار رہوں گے اور یہ ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ اکاڈمی کے اثاثہ کے طور پر فکسڈ ڈپازٹ کے ذریعے اتنے پیسے جمع کردیئے جائیں جن سے ریکرنگ اخراجات پورے ہوجائیں۔ اس سلسلے میں ملت کے صاحبانِ ثروت پیش قدمی فرما کر ممبرشپ اور عطایا کے ذریعہ مطلوبہ رقم کی فراہمی کا کام کرسکتے ہیں۔

شاہد اختر : معاف کیجیے گا، آپ نے اپنا سارا سرمایۂ حیات نوادرات کے حصول، کتابوں کی خرید اور ابن سینا اکاڈمی کی عظیم الشان تعمیر میں لگادیا۔ میرے خیال میں ایسا کرنے کا حوصلہ آپ کم پاتے اگر آپ کو اپنی شریک حیات اور بچوں کا مکمل تعاون نہیں ملا ہوتا۔ آپ ذرا ان بے ریا مخلصین کے بارے میں تفصیلی معلومات

فراہم کرنے کی زحمت کریں۔

پروفیسر ظل الرحمٰن : میرے گھر میں جب میرے بچے چھوٹے تھے، چڑیوں نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ چڑیا آتی اور اپنے بچوں کے منہ میں دانہ ڈالتی۔ ایک بلی بھی تھی جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتی تھی۔ میں اپنے بچوں کو بتاتا تھا کہ ان کو دیکھو، اپنے بچوں کی کتنی فکر کرتے ہیں۔ دوسرے جانور بھی یہی کرتے ہیں۔ اگر انسان بھی صرف اپنے بچوں کی فکر کرے تو اس میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ انسان اپنے بچوں کے علاوہ اعزہ، احباب، سماج، مذہب، زبان اور علم و ادب کی فکر کرتا ہے اور ان پر خرچ بھی کرتا ہے۔ پہلے کے لوگ کنوئیں کھدواتے، سرائے بنواتے اور رفاہ عام کے کام کرتے تھے۔ آج کا آدمی کرتا بھی ہے تو دوسروں کے چندے پر کرتا ہے، اپنا کچھ نہیں لگاتا۔ سر سیّد نے تو ایسا نہیں کیا۔ اپنی عمر بھر کی پونجی لگائی۔ سیّد محمود اور خود دس سالہ پوتے راس مسعود سے بھی چندہ لیا۔ غالباً میری انہی باتوں نے ان کا ذہن کچھ اس انداز کا بنا دیا کہ سب نے میری بھرپور معاونت کی۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ میرا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹے سیّد ضیاء الرحمٰن نے علی گڑھ سے ہی ایم بی بی ایس اور ایم ڈی کیا ہے۔ فارسی سے موروثی تعلق نے ان کو بھی اس طرف مائل کیا اور انہوں نے فارسی کا سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس کر رکھا ہے۔ ماشاء اللہ اس کم عمری میں ہی ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس اکاڈمی کو ان کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ میری بہو نازنین رحمٰن بھی اکاڈمی سے پوری دلچسپی رکھتی ہیں۔ میری تینوں بیٹیاں—— صفیہ، صوفیہ اور آصفہ نے علی گڑھ سے بالترتیب انگلش اور اکانمکس میں ایم اے کیا ہے۔ میرے دونوں داماد اچھے عہدے پر ہیں۔ بڑے داماد ڈاکٹر سیّد تصور حسین کشمیر یونیورسٹی میں ژولوجی کے استاد ہیں۔ منجھلے ڈاکٹر سیّد شعیب احمد سعودی عرب میں آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔ کثرت سے تلاوت قرآن اور تواتر کے ساتھ روزے رکھنے والی میری شریک زندگی احمدی بیگم جو میرے بڑے ماموں کی صاحبزادی ہیں، گھریلو تعلیم رکھنے کے باوجود علم کی بہت بڑی قدر دان ہیں۔ تمام نوادرات کی حفاظت انھوں نے جس انداز سے کی، وہ انہیں کا حصہ تھا۔

شاہد اختر : صدرِ جمہوریہ نے ۱۹۹۵ء میں آپ کی فارسی زبان و ادب کی خدمت کے اعتراف میں اعزاز سے بھی نوازا ہے۔ ان خدمات سے ہمیں بھی آگاہ فرمایئے، جنہوں نے آپ کو صدارتی میڈل کا حق دار بنایا؟

پروفیسر ظل الرحمٰن : فارسی میں میری کئی کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ (۱) رسالہ جودیا ابن سینا (۲) عہد سلطنت کی ابتدائی طبی کتاب طب فیروز شاہی: از شاہ قلی (۳) رسالہ ادویہ قلبیہ (۴) اسماء الادویہ-حکیم اعظم خاں (۵) رسالہ آخر پلال عماد الدین محمود شیرازی-ان پانچ کتابوں کی تہذیب و تدوین کے علاوہ ایران کے صفوی عہد کی علم تشریح کے مطالعے پر ایک کتاب لکھی۔ دو فارسی کتابوں کے اردو ترجمے کئے۔ ایک بیاض وحیدی دوسری مطب مرتعش اس کے علاوہ ابن سینا کے تعلق سے علم الامراض کے شیخ الرئیس نمبر قانون ابن سینا اور اس کے شارحین اور مترجمین میری کتابیں ہیں۔ تین مرتبہ ایران جانے کا موقع ملا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو مقالات میں نے قلمبند کئے

ہیں۔ان میں سے بیشتر فارسی ماٰخذ سے تعلق رکھتے ہیں۔میری ایران شناسی پر ایک کتاب ایران نامے سے شائع ہو چکی ہے۔یہی وہ حقیر خدمت ہے جس کے اعتراف میں صدرِ جمہوریہ نے اعزاز سے نوازا ہے۔

شاہد اختر : کوئی پیغام؟

پروفیسر ظل الرحمٰن : ہماری قیادت کی بڑی کمزوری ظاہر اور باطن کا فرق اور قول و فعل میں تضاد ہے۔ہمارے زعماءِ قوم کے درد و غم کا جس کثرت سے تذکرہ کرتے ہیں، اس کا عشرِ عشیر دل میں پیدا ہو جائے تو ملت کی کایا پلٹ جائے۔خدمت کی جگہ تجارت ہمارا شعار ہے۔نوجوانوں سے میری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔وہ ملت کا قیمتی اثاثہ ہیں۔اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نوجوانوں میں جوش و عمل اور جذبۂ خلوص دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔انکی صداقت کی گرمی اُمید بندھاتی ہے کہ نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہمارا مستقبل محفوظ رہے گا۔ان کے لئے ہمارا پیغام ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک پر عمل کرتے ہوئے منافقت سے بچیں تاکہ دین اور دنیا کی کامیابیاں ان کے قدم چومیں۔شرافت، وضع داری، انصاف اور مہمان نوازی جیسے صفات عالیہ پیدا کریں تاکہ اس صدی کی امامت کے اہل ہو سکیں۔

انٹرویو کے بعد پروفیسر سیّد ظل الرحمٰن صاحب نے مجھے اور اشتیاق اعظمی کو تجارا ہاؤس کے باہری دروازے تک چھوڑا۔ہم برولا مارکیٹ پیدل آئے۔وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور ایک رکشا والے کی 'مہربانی' سے اکاڈمک اسٹاف کالج چلے آئے۔

۸ر مئی لیکچرز کا آخری دن تھا، اس لئے اس کو ہر حیثیت سے یادگار ہونا تھا۔ہم لوگ لیکچر ہال میں پہنچے تو آج ہمیشہ تاخیر سے۔پہنچنے والے بھی وقت پر حاضر تھے۔حسب معمول ڈاکٹر صغیر افراہیم آج کے پہلے رِیسورس پرسن پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو لے کر تو آئے مگر اتنا کہہ کر چلے گئے کہ یہ اپنا تعارف آپ ہیں۔قاسمی صاحب نے ''نئی ادبی تغیرات'' کے عنوان سے یادگار خطبہ دیا۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

والا معاملہ تھا۔پورا ہال ہمہ تن گوش تھا۔کہیں سے کوئی سرگوشی کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ہوش تو اس وقت آیا، جب ان کی تقریر ختم ہو گئی۔چائے کا وقفہ ہوا۔چائے کے وقفے میں دورانِ گفتگو قاسمی صاحب نے جو Compliments دیئے، وہ میرے لئے سرمایۂ افتخار بن گئے۔وقفے کے بعد ہم سب کے بڑے بھائی پروفیسر خورشید احمد نے ن-م-راشد پر فاضلانہ گفتگو کی۔راشد کی ذات، ان کا ادبی رویہ، حلقۂ اربابِ ذوق اور اردو ادب پر ن-م-راشد کے اثرات پر خورشید بھائی نے فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ بحث کی۔چائے کے دوسرے وقفے کے بعد قاضی جمال حسین نے ''ادب کے بدلتے رجحانات'' پر بھرپور گفتگو کی۔انگریزی ادب کے مطالعے اور جدیدیت سے لگاؤ نے قاضی صاحب کی اس تقریر کو وقیع بنانے میں معاونت کی۔

دن کا کھانا کھا کر ذرا آرام کیا گیا۔بعد نمازِ عصر اکاڈمک اسٹاف کالج کی جانب سے 'سٹ ٹو گیدر' کا پروگرام ہونا تھا۔ساڑھے پانچ بجے سٹ ٹو گیدر کا رنگا رنگ پروگرام شروع ہوا۔اردو، جغرافیہ اور فیزکس کے Participants کے چمکتے چہروں کو مزید چمک دینے کی خاطر پروفیسر حمیدہ احمد، پدم شری پروفیسر محمد شفیع (مشہور جغرافیہ داں)، پروفیسر فرحت اللہ خاں تینوں کورس کو آرڈی نیٹرز، یونیورسٹی کے سینئر اساتذہ اور علی گڑھ کی نوجوان نسل کے شعرا محفل میں موجود تھے۔کوآرڈی نیٹرز نے مختصراً اپنے تاثرات بیان کئے۔ہلکا پھلکا ثقافتی پروگرام ہوا اور پھر شرکائ

میں سے سینئرز کو تاثرات بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔ اپنے کورس کی جانب سے یعقوب بھائی کے بعد مجھے بلایا گیا۔ میں نے اکاڈمک اسٹاف کالج، ریفریشر کورس اور اپنے ساتھیوں کے خلوص ومحبت کا تذکرہ کیا اور اپنی کل والی غزل (جو جبریہ کہلوائی گئی تھی) سنانے سے قبل سامعین کو یہ خوشخبری دی کہ اسی کورس کے دوران ہمارے بھائی اشتیاق اعظمی کو ڈی لٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ موجود لوگوں نے زوردار تالیوں سے اس خوشخبری کا استقبال کیا۔ میں نے بتایا کہ اسی دشمن جاں نے مجھ سے کل یہ غزل کہلوائی ہے، اس لئے آپ کو میری غزل برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ پدم شری پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر حمیدہ احمد کی تقریروں پر اس تقریب کا خاتمہ ہوا۔ پُر تکلف ناشتہ کرایا گیا۔ تقریب کے بعد علی گڑھ کے نوجوان شعراُ کمرے میں آئے۔ دیر تک ان سے گفتگو کا سلسلہ رہا۔ کل صبح نو بجے مختصر اختتامی تقریب کے بعد ہی کورس میں شامل افراد نکلنا شروع ہو جائیں گے۔ بہت سارے لوگوں کا ریزرویشن اسی طرح کا ہے کہ وہ گیارہ بجے تک اکاڈمک اسٹاف کالج چھوڑ دیں گے۔ میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ہم نے واپسی کا جو ٹکٹ کرایا تھا، وہ ۱۲رمئی کا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میرے رفیق کار کا پروگرام تبدیل ہو گیا۔ انہیں پٹنہ ٹھہرتے ہوئے کلکتہ جانا ہے۔ میں نے اپنی پریشانی آفتاب کے کمرہ ۲۷ ۳ میں شیئر کی تو نورالزماں (جنہیں ان کے ساتھی ماسٹر صاحب کہتے ہیں اور جو علی گڑھ کے ان سینکڑوں طلبہ میں سے ایک ہیں، جو کسی حال میں علی گڑھ چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ ایک کورس کے ختم ہونے کے بعد دوسرے کورس میں داخلہ لے لیتے ہیں، انہیں کسی صورت علی گڑھ کی جدائی گوارہ نہیں ہے) نے مجھ سے کہا کہ شاہد بھائی! آپ پریشان نہ ہوں، کل صبح تت کال ٹکٹ کا انتظام کرنا میری ذمہ داری۔ رات کے گیارہ بجے نورالزماں اور مولانا شاکر کمرے میں آئے۔ مجھ سے آئیڈنٹیٹی کارڈ کی زیروکس کاپی لی۔ ٹکٹ کے پیسے لئے اور چلے گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ دبیر بھائی کو صبح پانچ بجے اسٹیشن بھیج کر لائن میں لگ جانے کو کہیں۔ ہم صبح سات بجے تک انہیں ریلیز کر دیں گے تاکہ وہ اختتامی پروگرام میں شرکت کر سکیں۔

۹رمئی کو نمازِ فجر کے بعد ہی میری خاطر میرے بھائیوں (دبیر احمد اور اشتیاق اعظمی) نے اسٹیشن جانے کی زحمت گوارہ کی۔ ٹکٹ کاؤنٹر کی لائن میں لگے۔ صبح سات بجے وعدے کے مطابق نورالزماں اور مولانا شاکر نے انھیں فرصت دی۔ آٹھ بجے کاؤنٹر کھلا اور برادرم نورالزماں نے کالکا میل سے آئندہ کل کے لئے تت کال سیوا کا ریزرویشن لینے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ ساڑھے آٹھ بجے ان لوگوں نے ریزرویشن میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے شکریہ ادا کرنے سے منع کر دیا۔ دل سے دعا نکلی کہ رب تعالیٰ ان دونوں کو سلامت رکھے اور ان کی تمام جائز تمنائیں پوری فرما دے۔ ٹھیک نو بجے اختتامی پروگرام شروع ہو گیا۔ اس پروگرام کو زینت بخشنے والوں میں وائس چانسلر جناب حامد انصاری (موجودہ چیئرمین قومی اقلیتی کمیشن) کا نام بھی شامل تھا مگر نو بجے تک انکی تشریف آوری نہیں ہوئی تو ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر پروگرام شروع کر دیا گیا۔ ڈائریکٹر صاحبہ نے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے وائس چانسلر کی Punctuality کا یہ عالم ہے کہ وہ دیئے گئے وقت سے پہلے تو آتے ہیں، دیر سے کبھی نہیں۔ وقت معینہ پر ان کی عدم شرکت اس بات کا اعلان ہوا کرتی ہے کہ وہ کسی دوسرے ضروری کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی پابندیٔ وقت نے مجھے ایک ناقابلِ فراموش واقعے کی یاد دلا دی۔ واقعہ یہ ہے کہ رام کرشنا مشن، نریندر پور (مغربی بنگال) کی ایک علمی اور ثقافتی تقریب میں مغربی بنگال کے سینئر وزیر مدعو تھے۔ دن کے گیارہ بجے تقریب کا افتتاح انہیں کے ہاتھوں ہونا تھا۔ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے، کرسیٔ صدارت پر سوامی لوکیشو رآنند جلوہ افروز ہوئے۔ مشن کے کلچرل سکریٹری نے دوسری کرسی سنبھالی۔ تیسری کرسی جو وزیر موصوف کے لئے مخصوص تھی، خالی تھی۔ گیارہ بجتے ہی پروگرام شروع کر دیا گیا۔ منتری مہودے پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچے۔ انہیں سامعین کی پہلی صف میں بٹھایا گیا۔ ان کی خالی کرسی پروگرام کے اختتام تک انہیں شرمسار کرتی رہی۔

بہرحال ہمارا پروگرام ٹھیک وقت سے شروع ہوا اور ایک بار پھر ہم پروفیسر حمیدہ احمد کی عالمانہ گفتگو کے سحر میں کھو گئے۔ان کی تقریر کے بعد انگریزی حروفِ تہجی کے اعتبار سے پہلے جغرافیہ، پھر فیزکس اور آخر میں اُردو کے Participants میں اسناد کی تقسیم ہوئی۔ تحفے میں کتابیں ملیں اور ٹی اے، ڈی اے کی بقایا راشی کا بھگتان ہوا اور قافلے کوچ کرنے لگے۔ ہم گلے لگ لگ کر ایک دوسرے کو الوداع کہتے رہے۔معین الدین جینا بڑے اور مظہر مہدی کو چھوڑنے انعام الحق اسٹیشن تک گئے۔تھوڑی دیر میں اُڑیسہ کے بھائی اسرائیل اور منظور احمد خاں نکلے۔حامد اشرف، سہیل بیابانی، بیگ اختر مرزا اور وحید پاشا کو ہم نے بادیدۂ نم رُخصت کیا۔اختر شاہ، ابراہیم شیخ اور ہماری دو گجراتی بہنوں کی روانگی احمد آباد کے لئے ہوئی۔اپنی سب سے چھوٹی اور بہت پیاری بہن فرزانہ ایم شیخ کو الوداع کہتے ہوئے دل بھر آیا۔فرزانہ کے خاوند نے بھی فرزانہ کے لئے کیا قربانی دی۔ پورے تیس دن وہ اپنی مصروفیات سے دست کش ہو کر بیگم اور بچی کے ساتھ یہیں علی گڑھ میں مقیم رہے۔یعقوب یاور، نفیس بانو اور نفیس کی پیاری بٹیا کی روانگی ہوئی۔اس طرح یکے بعد دیگرے تقریباً سبھی چلے گئے۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔دن کا کھانا کھا کر ہم تین چار جو بچ گئے تھے، اپنے کمروں میں ستانے لگے۔عصر بعد ڈاکٹر رضوان الرضا، ڈاکٹر بدرالدجیٰ خاں ،ایم ڈی (معالجات) اور مغل فاروق پرواز کمرے میں تشریف فرما ہوئے۔ڈاکٹر رضوان الرضا جو ایک خوش فکر شاعر ہیں، نے اپنا مجموعۂ کلام ''خوابوں کا سفر'' عنایت کیا۔مغل فاروق پرواز نے ایک نظم اور دو پیاری غزلیں سنا کر ہمیں سرشار کیا۔ڈاکٹر بدرالدجیٰ خاں نے طلبہ تنظیم اور تحریک سے اپنی وابستگی کے تجربات سنائے۔ مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ساتھ پڑھی۔ بعد نماز مغرب بھائی ڈاکٹر صغیر افراہیم اور بہن سیما سے رخصت لینے میڈیکل کالونی گئے۔واپسی میں آفتاب پہنچے۔اتنی کم مدت میں جو بچے جان سے زیادہ عزیز ہو گئے تھے، ان سے بغل گیر ہوئے۔انہیں بہت لمبی اور بہت کامیاب زندگی کی دعائیں دیں اور بوجھل قدموں سے اکاڈمک اسٹاف کالج میں علی گڑھ کے قیام کی آخری شب گزارنے کے لئے لوٹ آئے۔ جو حالت ۷/ اپریل کی شب کو تھی، وہی حالت ۹/مئی کی شب کو تھی۔تب اپنوں سے جدائی کی خلش اور خوابوں کی جنت کو جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کی بے تابی تھی، اب ایک بار پھر اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور اپنوں سے ملنے کی خوشی کے ملے جلے احساسات تھے، جو کسی کروٹ سونے نہیں دے رہے تھے۔ پرویز شاہدی یاد آ رہے تھے :

موقع یاس مجھے تیری نظر نے نہ دیا　　　شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

۱۰/مئی کو نمازِ فجر کے بعد پیکنگ کا ادھورا کام پورا کیا۔ہم لوگوں نے اسلام کے ڈھابے پر چائے پی اور دبیر احمد کو ہوسٹل کے لئے رُخصت کیا۔ بھائی اشتیاق نے اپنا اسباب کل ہی ہوسٹل میں منتقل کر دیا تھا۔دبیر پٹنہ جائیں گے اور اشتیاق پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے وائی وا کے لئے مراد آباد جائیں گے۔ اشتیاق اعظمی نے مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے بعد ہوسٹل منتقل ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔نو بجے سے پہلے ہم دونوں اسٹیشن روانہ ہوئے۔ٹھیک ساڑھے نو بجے کا کالکا میل پلیٹ فارم نمبر ایک پر لگی۔ بھائی اشتیاق اعظمی نے اِنٹرین ہونے میں میری مدد فرمائی۔ گلے لگے اور کھڑکی کے پاس چلے آئے۔ جب ٹرین نے ہارن دیا، ہم دونوں ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔

ٹرین چلی، جذبات کا غلبہ کم ہوا تو اپنے ساتھی مسافروں پر نظر پڑی۔تت کال کا ڈبہ چونکہ ایسے ہی مسافروں سے بھرا ہوتا ہے، جن کو فوری ضرورت سفر پر مجبور کرتی ہے یا جو میری طرح پروگرام کی اچانک تبدیلی کی وجہ سے تت کال سیوا کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔میرے برتھ کے سامنے کی تینوں برتھوں کے لئے ایک ہی خاندان کے تین افراد اپنے کسی عزیز کے انتقال کے بعد شرادھ کے لئے کلکتہ جا رہے تھے۔دو جوان تھے اور ان کی بوڑھی ماں تھیں۔میری برتھ نیچے کی تھی۔اوپر کی برتھوں میں ایک صاحب میرٹھ کے تاجر تھے اور انہیں ڈانکونی (ہوڑہ سے قریب کی صنعتی

پٹی) کسی تجارتی ضرورت سے آنا پڑ رہا تھا اور ایک نوجوان تھا جو لدھیانہ سے کٹک کے سفر پر تھا۔ سائڈ کی دونوں برتھوں پر جے این یو کی طالبات تھیں۔ ایک کو آسنسول اور دوسری کو کلکتہ جانا تھا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت، اِسمارٹ اور خوش گفتار تھیں۔ ہندوستانی اچھی بول لیتی تھیں۔ میں نے ان سے بنگلہ میں گفتگو شروع کی تو فوراً گھل مل گئیں۔ ٹرین کے کانپور پہنچتے پہنچتے میرٹھ والے سجن اتنے مانوس ہو گئے کہ لطیفے سنانے لگے۔ ان میں سے اکثر لطائف کا ہدف سردار جی لوگ تھے۔ ان کے لطیفے سن کر بڑی بی کا ہنسنا اور ان کے چہرے کے زاویوں کا بننا بگڑنا ہمارے لئے ہنسی کی ایک اور وجہ بن رہا تھا۔ بالخصوص بنگالی لڑکیاں لوٹ پوٹ ہو جا رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا پھیلتے پھیلتے ہم منڈا روڈ پہنچ گئے۔ راجہ وِشوا ناتھ پرتاپ سنگھ کی نگری۔ وی پی سنگھ یاد آئے تو منڈل کمیشن کی بات نکلی۔ ریز رویشن کی حمایت اور مخالفت میں ہوئے جان لیوا ہنگامے یاد آ گئے۔ مرزا پور تک اندھیرا ہو چکا تھا اور اب ہم سب دن بھر کی باتوں اور ہنسنے ہنسانے کے کاموں میں تھک بھی گئے تھے۔ اب کبھی کبھار کوئی کچھ بول دیتا اور کوئی ایک جواب دے دیتا۔ کٹک والا بچہ اوپر کی برتھ پر تھا۔ اس نے کھانا کھایا، لیٹا اور فوراً خراٹیں لینے لگا۔ بچیوں نے بھی برتھیں سنبھالیں۔ سامنے والا خاندان پکوان کے ڈبے کھول چکا تھا۔ میرٹھ والے بھائی نے میری مشکل آسان کی۔ بیچ والی برتھ کھلی تو مجھے بھی دراز ہونے کا موقع ملا۔ کل کی بے خوابی اور دن کی تھکن نے جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

۱۱ رمئی کی صبح پانچ بجے کالکا بردوان پہنچی۔ میں نے میرٹھ والے مہاراج، کٹک والے نوجوان اور کلکتہ والی لڑکی کو الوداع کہا۔ (ایک لڑکی کو آسنسول میں الوداع کہہ چکے تھے) سامنے والی تینوں برتھوں پر لیٹے ہوئے افراد کی نیند خراب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بردوان میں ہوڑہ مین لائن لوکل پر بیٹھنے کے بعد تازہ اخبار دیکھنے کا خیال آیا۔ گذشتہ کل انتخابات ہوئے تھے۔ یہ پڑھ کر اطمینان ہوا کہ خدشات سے کم حادثات ہوئے۔ اس بار کا الیکشن بایاں محاذ پہلی بار بدھا دیب بھٹا چاریہ کی جوان قیادت میں لڑ رہا تھا۔ اپوزیشن کی طرف سے چیف منسٹر شپ کی دعویدار ممتا بنرجی بی جے پی سے رشتہ جوڑ کر اپنا وقار کھو چکی تھیں۔ اپنے اسٹیشن مانکنڈو پہنچا تو وحشتؔ کے مطابق :

؎ خبر دیتی تھی خود بیتابیِ دل قربِ منزل کی

گھر پہنچا تو منتظر آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ بچوں کے ہنگاموں سے بیگم نے بمشکل مجھے نکالا اور غسل خانے میں دھکیل دیا۔ ان کو کیا خبر تھی کہ مجھے گھر واپس آ کر جو آسودگی مل چکی تھی، وہ نل کے ٹھنڈے پانی کی محتاج نہیں تھی۔

۱۱ رمئی ۲۰۰۱ء کو بیتے پورے پانچ سال ہو گئے مگر علی گڑھ کی یادیں اس طرح تازہ ہیں کہ جیسے کل کی باتیں ہوں۔ جب کوئی علی گڑھ جاتا ہے تو میں اس کی آنکھوں میں اپنی حسرتِ دیدار بھر دینا چاہتا ہوں۔ کوئی آتا ہے تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر علی گڑھ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عجیب صورتِ حال ہے۔ میرے ساتھ علی گڑھ وہی کر رہا ہے جو غالبؔ کے ساتھ کلکتہ نے کیا تھا :

ع ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اردو زبان و ادب کو
دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچایئے
یہ کتاب
کسی دوست کو ای میل کیجئے

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کام

اس قسم کے بڑی فائلیں کسی کو بھیجنے کا آسان طریقہ

www.ifrendz.com/upload

بڑی سے بڑی فائل بھیجئے۔۔۔۔منٹوں میں

بھیجنے والا بھی خوش۔۔۔۔۔پانے والا بھی خوش